Registered No. L. 5340

جلد ۳۲

ذی الحجہ ۱۳۶۸ھ

عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

نعیم صدیقی

جاری کردہ :

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۱۰۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور

قیمت سالانہ پانچ روپے	برائے پاکستان	قیمت فی پرچہ آٹھ آنے
" سات روپیہ آٹھ آنے	برائے ہندوستان	" گیارہ آنے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(۱)

ادھر دو سال سے تحریکِ اقامتِ دین کے عوامی دور کا آغاز ہونے کے بعد سے اپنی ملت کے مختلف عناصر کو قریب سے دیکھنے کا جو موقع ملا ہے اس کے دوران میں نہایت تلخ حقائق سامنے آئے ہیں وہ حقائق جن کا علم اب تک ہوا ہے ان کے پیشِ نظر اندازہ ہوتا ہے کہ بحیثیتِ قوم ہم اگر جی رہے ہیں تو یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے۔

اس وقت ہمارے مختلف عناصر کے اندر نہایت مہلک قسم کے ذہنی و اخلاقی روگ پھیل چکے ہیں جو اندر ہی اندر ہماری اجتماعی قوت کو گھن کی طرح کھا رہے ہیں۔ پھر ان روگوں کی چھوت ایک سے دوسرے کو لگتی جا رہی ہے۔ اور ہمارے کتنے ہی قیمتی افراد ہیں جو بیماریوں کا سرچشمہ بن چکے ہیں، اور اپنے گندے منتقل کر کے معاشرے میں پھیلاتے جا رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے ذہنی و اخلاقی مفسدات جسمانی امراض سے زیادہ تباہ کن ہیں اور یہ اس سے زیادہ توجہ کے مستحق ہیں جتنی توجہ ہم ملیریا، چیچک اور تپ دق وغیرہ پر صرف کر رہے ہیں۔ ان جسمانی وباؤں سے ملت کے افراد پر تباہی وارد ہوتی ہے۔ لیکن جن نفسیاتی و سوشل بیماریوں کی طرف ہم اشارہ کر رہے ہیں وہ اس نوعیت کی ہیں کہ قوموں اور ملتوں کو لے بیٹھتی ہیں۔

آج کی صحبت میں ہم ان مختلف امراض کے تذکرے کا آغاز کر رہے ہیں جنہوں نے ہمارے اکابر اور عوام میں ایک بڑی تعداد کو اپنے پنجوں میں دبوچ رکھا ہے۔ امراض کے ساتھ مریضوں کا تذکرہ ناگزیر ہے لیکن اس تذکرے سے جہاں ہمارا مقصود یہ نہیں ہے کہ کچھ لوگوں کو چھیڑا اور چڑایا جائے، وہاں متعلقہ افراد و عناصر کو بھی حسنِ ظن سے کام لیتے ہوئے اصل حقائق پر غور کرنا چاہیئے، اور ان کی اصلاح کے لئے فکرمند ہونا چاہیئے ——— مثلاً یہ کہ علامات و اسبابِ مرض کا تجزیہ کرنے پر محض اس وجہ سے

اشتعال دکھایا جائے۔ کہ کیوں اس تجزیے نے ایک چھپے مرض کو واضح کر دیا اور صحت و تنومندی کے جھوٹے زعم کی قلعی کیوں کھول دی۔ آخر غور کیجئے کہ اگر سِل کے مادے سے متاثر شدہ مریض کو کوئی شخص مختلف علامات سے استدلال کر کے بروقت متنبہ کر دے۔ کہ تمہیں اپنے علاج کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے تو یہ اشارہ کوئی گالی تو نہیں کہ اس پر برا منایا جائے۔ بلکہ یہ سچی خیر خواہی ہے۔ بالکل اسی طرح ہم یہ سطور پورے خیر خواہانہ جذبے سے سپردِ قلم کر رہے ہیں۔ لیکن اگر کوئی ان حقائق کے واضح ہونے پر رنجیدہ ہو جن کو ہم عرض کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے لئے صبر کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔

درحقیقت جن مفاسد کا ہمیں تذکرہ کرنا ہے وہ خود تحریکِ اقامتِ دین کی راہ میں ایک مستقل رکاوٹ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان سے چشم پوشی نہیں کر سکتے۔ غور فرمایئے کہ کیا ایک سلطنت اپنی فوج کو دشمنوں کے مقابلے کے لئے مضبوط تر بنانے کا پروگرام سامنے رکھنے کے بعد عوام کی صحت سے غفلت برت سکتی ہے۔؟ ——— یقیناً نہیں! تو بالکل اسی طرح اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے اگر ہم دنیا کے ہر کلمۂ کفر و شرک کے خلاف علمِ جنگ بلند کر رہے ہیں۔ اور اس مقصد کے لئے سرفروشانِ حق کی ایک سپاہ کو منظم کرنے میں مصروف ہیں۔ تو ہمارے فرائض میں یہ بات بھی بنیادی طور پر داخل ہے کہ ہم اپنی ملت کی ذہنی، نفسیاتی اور معاشرتی و اخلاقی صحت کے معیار کو ترقی دینے کی سعی کریں۔ پھر یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ اگر کسی ملت کے اجتماعی، اخلاقی ماحول میں چند وبائیں پھوٹ پڑی ہوں، وہاں اگر ان وباؤں کی روک تھام کی تدابیر اختیار نہ کی جائیں تو بڑے سے بڑا ڈاکٹر اور طبیب اور مضبوط سے مضبوط پہلوان بھی زیادہ دیر تک اپنے آپ کو ان وباؤں سے نہیں بچا سکتا۔ خود ہماری اپنی ذہنی و اخلاقی صحت کا دارومدار بھی اسی پر ہے کہ ہم اپنے ماحول کی تطہیر سے غافل نہ ہوں۔

ہم اس حقیقت کا بھی شدید احساس رکھتے ہیں۔ کہ جن امراض پر ہم گفتگو کرنا چاہتے ہیں، ان امراض کو اپنے اندر پال کر ہم ایک آزاد قوم کی حیثیت سے ایک مملکت کو ترقی کی راہ پر لے چلنے کی نازک ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ یہ عجیب بات ہے کہ آزادی کا آفتاب طلوع ہو گیا، لیکن ہماری ذہنی و روحانی دنیا میں ابھی وہ ساری تاریکیاں اطمینان سے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں جنہوں نے

غلامی کی رات کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔ یہ تاریکیاں گویا یخ بستہ ہو چکی ہیں، اور اب ان کو بڑی محنت سے کھرچ کھرچ کر کے ضمیروں سے الگ کرنا پڑے گا!

ہمارے ملک میں ایک بہت بڑا گروہ ایسے لوگوں کا پایا جاتا ہے جو یقین و عزم کے جوہرِ حیات افزا سے بالکل محروم ہو چکا ہے ——— حالانکہ اس جوہر کے بغیر اجتماعی زندگی کا استحکام کبھی ممکن نہیں ہوا۔ اس ضروری جوہر کو گنوا دینے کے بعد یہ گروہ ایک انتہائی "قنوطیت" کے خطرناک مرض کا شکار بن چکا ہے۔ اس مرض کا خاصہ ہے کہ یہ جب رونما ہو جاتا ہے تو مریض میں کسل، ضعف، ناکارہ پن اور وہن کے آثار ابھر آتے ہیں۔ صبح و شام گردش کرتے ہیں، لیکن قنوطیت کے مریض کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ تاریخ کے ورق الٹے چلے جاتے ہیں، لیکن "اہل یاس" کے اندر کوئی حرکت نمودار نہیں ہوتی۔ فرائض پکارتے ہیں اور ذمہ داریاں بلاتی ہیں، لیکن متاعِ یقین و عزم کو کھو بیٹھنے والوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ انقلاب کے قافلے جرس بجاتے ہوئے ان کے سامنے سے گزرتے ہیں، لیکن ان کی رگوں کا خون بدستور منجمد رہتا ہے۔ ذلتیں، نکبتیں اور مصیبتیں ان کو جھٹکے لگاتی ہیں، لیکن ان کی آنکھیں نہیں کھلتیں!

ایسا ایک کثیر التعداد گروہ ہمارے درمیان موجود ہے۔ اس گروہ کے قنوطیت زدہ افراد باطل کی سرگرمیوں کو دیکھتے ہیں اور ان پر کڑھتے بھی ہیں، لیکن اصلاح کی کسی تدبیر کے کامیاب ہونے کا ان کو یقین نہیں۔ حق کو حق مانتے ہیں اور شاید دلوں میں اس کے غلبے کے لئے دعائیں بھی کرتے ہیں لیکن یہ توفیق نہیں کہ حق کی پکار پر اٹھ کھڑے ہوں اور اپنی قوتوں کی پونجی اس راہ میں لگا دیں۔ ان کو جب کبھی دعوتِ کار دی جاتی ہے۔ تو "بات ٹھیک ہے" کہہ کر پھر حالات کی ناسازگاری اور لوگوں کی نااہلیت کا رونا رونے لگ جاتے ہیں۔ ہر دعوتِ حرکت کے مقابلے میں ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ بس اب کچھ نہیں ہو سکتا۔

مختصر یہ کہ قنوطی گروہ نہ صرف یہ کہ خود ہی مردانگی کو ایک مرتبہ رو پیٹ چکا ہے، بلکہ دوسروں کو بھی مایوسی کی چھوت لگانے میں سرگرمِ عمل ہے۔

ہمارے "مریضانِ قنوطیت" کی چند اقسام ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی علامات اور ہر ایک کے

اسبابِ مرض جداگانہ ہیں۔ ان کی مختلف اقسام کا الگ الگ تذکرہ کئے بغیر بات نہ کھلے گی۔

"مریضانِ قنوطیت" میں سے انتہائی خطرناک حالت تو اس گروہ کی ہے جو اپنے آپ سے مایوس ہے تو اس وجہ سے ہے کہ وہ خدا اور اسلام ہی سے مایوس ہو چکا ہے۔ اس گروہ کا مرض قریب لاعلاج ہے۔ اِلّا ماشاء اللہ!

اس طبقۂ اولیٰ کی بیماری کی جڑ یہ ہے کہ زبان سے خدا اور اس کے دین کو ماننے کے باوجود اور مسلمانوں کی سوسائٹی سے تعلق رکھنے کے باوجود اس کو خدا کے وجود ہی میں شک ہے۔ پھر اگر خدا کے وجود کا کوئی رسمی تصور ہے بھی تو اس کی صفات پر شعوری ایمان تو بہرحال باقی نہیں ہے۔ یوں سمجھئے کہ ہمارے ہزاروں بھائی ایسے ہیں جو سرے سے یہ احساس رکھتے ہی نہیں کہ کوئی ایسی ہستی کائنات کی خالق و ناظم ہے جو با اختیار ہے، جو عادل ہے، جو تقدیر ساز ہے، جو جزا و سزا دینے والی ہے، جو انسان کے لئے حق کی راہوں پر چلنے میں حامی و ناصر ہے، جو قربانیوں کو ضائع جانے نہیں دیتی، جس نے کوئی اخلاقی ضابطے اور تمدنی قوانین بنائے ہیں، جس کی ہدایت پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے، جس کے وعدوں پر یقین قائم ہو سکتا ہے۔ اور جو عالم الغیب والشہادۃ ہے۔

ان حضرات کے ذہن اندر سے فلسفۂ الحاد کے سامنے مفتوح ہو چکے ہیں، چنانچہ خدا کے متعلق صحیح عقیدے کے برقرار نہ رہنے کی وجہ سے ان کے دلوں کی گہری تہوں میں "اسلام" سے بھی پوری پوری مایوسی اور بددلی پیدا ہو چکی ہے۔ یہ لوگ "اسلام زندہ باد" بھی پکارتے ہیں، نماز روزہ بھی کر لیتے ہیں، نبی صلعم اور قرآن سے وابستگی کا اظہار کرنے میں بھی کوتاہی نہیں کرتے، لیکن ان کی روحیں اسلام کے منزل من اللہ ہونے کا یقین کھو چکی ہیں، یہ اسے تیرہ سو سال پہلے کا وقتی دین سمجھتے ہیں۔ اور دورِ حاضر میں اس کے احیاء اور اس کے چل نکلنے کے بارے میں پوری طرح بدگمان ہیں۔ پھر ستم یہ کہ ان کو یہ بھی بھروسہ نہیں ہے کہ اگر اقامتِ دین کی جدوجہد میں یہ جان و مال سے کوئی حصہ لیں تو ان کی گزاریں کا صلہ دینے والا کوئی موجود ہے جس کے پاس بیکراں خزانے ہیں۔ مگر ان کے سامنے ہر طرف تاریکی ہی

تاریکی ہے!

اس گروہ کے نزدیک ہر وہ اصول و نظام جو غالب ہو گیا ہو، اس کے سائے میں امن و چین سے جیئے چلے جانا اور ہر وہ ٹولی جو اقتدار پر قابض ہو گئی ہو اس کی رکاب تھام کر چلنا ہی بہترین مسلک حیات ہے!

چنانچہ جہاں تک باطل اصولوں اور غیر اسلامی نظاموں کے قائم کرنے اور چلانے کا تعلق ہے، یہ حضرات کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ ہر نظام کفر و شرک اور ہر تہذیب فسق و فجور کے کامیابی سے چل نکلنے کو ممکن تسلیم کر لیتے ہیں۔ ان کے قیام کیلئے جدوجہد کرنے والوں کی ہمنوائی کرنے میں بھی کوتاہی نہیں کرتے لیکن جہاں سوال اسلام کے اصول و نظام کا آیا بیچارے "اول، آں" کرنے کے سوا اور کسی قسم کا جذبہ دکھانے پر قادر نہیں ہوتے۔

یہ حضرات نہایت دیدہ دلیری سے مسلمان کہلا کر یہ بھی کہہ گزرتے ہیں کہ اسلام صحابہ کے ساتھ ختم ہو گیا تھا؟ کبھی کہتے ہیں اسلام کی ماہیت ہی آج تک مشتبہ ہے تو اسے لے کے چلنا کیا معنی؟ کبھی فرمائیں گے کہ اسلام کے بارے میں فرقی اور گروہی اختلافات اتنے کثیر ہیں کہ جہاں نظام اسلامی کے قیام کا سوال چھیڑا باہم اختلافات کا طوفان اٹھ کھڑا ہوگا، لہذا اس مشترک ورثے کو بس ایسا ہی پڑے رہنا چاہیئے۔ کبھی ارشاد ہوگا کہ آجکل دین کو پوچھتا کون ہے؟ سب کو اپنی دنیا بنانے کی پڑی ہے ——— الغرض یہ کسی طرح اپنی قوتوں کی کوئی رمق اسلام کے نبیے کے لئے صرف کرنے پر تیار نہ ہو سکیں گے۔

اس طبقے کو تو اسلام کے ان بنیادی عقیدوں کی دعوت دینے کی ضرورت ہے جن کو غیر مسلموں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کوشش کے نتائج کے ظہور کا انتظار کرنے کی ہمت جٹائی جائے۔

ان بیچاروں کی بالکل وہ حالت ہے (بلاتشبیہ تامہ) جسے قرآن نے "لا مولی لھم" کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اور یہ حالت اس حالت کے بالکل برعکس ہے جسے قرآن نے "اللہ ولی الذین آمنوا یخرجھم من الظلمت الی النور" کہہ کر پیش کیا ہے۔ یہ ایک بہت ہی قابل رحم حالت ہے جس پر ہر سچے مسلمان کو عملی ہمدردی کا ثبوت دینا چاہیئے۔ یہ ایک کارواں

ہے جس کی مشعل گل ہو چکی ہے۔ اور جو غول بیابانی کے نرغے میں گھرا ہُوا ٹامک ٹوئیے مارتا پھرتا ہے لیکن اس کی دشت نوردیوں کی کوئی منزل نہیں، بلکہ ان دشت نوردیوں کا حاصل صرف تکان ہے!

جو بدنصیب "ایمان باللہ" کے محور سے ہٹ گیا، اس کا اوّل بھی یاس و نومیدی ہے، اور اس کا آخر بھی یاس و نومیدی ہے۔ وہ محرومی کی منزل سے چلتا ہے، اور عمر بھر کے سفر کے بعد محرومی ہی کی منزل پر پہنچتا ہے ——— اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبِّیْ!

اس گروہ کے خوش بخت ترین افراد وہ ہیں جو خدا اور اس کے دین پر اپنا ایمان بالکل تو نہیں کھو بیٹھے لیکن اپنی سیاہ کارگزاریوں کے پیش نظر اپنے خدا سے اور اس کے دین سے بدگمان ہیں۔ چنانچہ ان کو خدا اور دین سے ملتا بھی وہی کچھ ہے جس کی یہ توقع رکھتے ہیں۔ جیسے کہ حضرت ابوہریرہؓ سے یہ ارشاد نبوی صلعم مروی ہے کہ یقول اللہ تعالیٰ انا عند ظن عبدی بی۔ یعنی میرا معاملہ اپنے بندوں سے ویسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ وہ مجھ سے توقع رکھتے ہیں۔

چنانچہ اللہ کے دین سے سوئے ظن رکھنے والوں کے پلّے نامرادی اور قنوطیت کے سوا اور کچھ نہیں پڑتا۔ اور اس طرح ان کی نامرادی اور قنوطیت میں اور اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ وہی بات کہ

فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا۔

ان کے دلوں میں بیماری ہے، اور پھر اللہ نے ان کی بیماری کو اور بڑھا دیا!

اس طرح کے لوگوں کی گرہ کشائی کی واحد صورت یہ ہے کہ ان کو اللہ سے اور اس کے دین سے اپنا معاملہ درست کرنے پر آمادہ کیا جائے، تا آنکہ یہ غیر شعوری ایمان سے نکل کر شعوری ایمان کی طرف آئیں، یہ دورنگی کو چھوڑ کر یک رنگی اور صبغت اختیار کریں، یہ نفاق اور تضاد کی آلائشوں سے ضمیروں کو پاک کریں، یہ خدا کے مقابلے میں چالیں چلنے سے باز آجائیں اور اس کے احکام وقوانین کا اپنے عمل سے مذاق اڑانا چھوڑ دیں۔ ان کا مرض نسبتاً زیادہ جلد علاج پذیر ہو سکتا ہے۔

دوسرا گروہ مایوسین جو سوسائٹی میں پھیلا ہوا ہے، ان لوگوں پر مشتمل ہے جو میدانِ سیاست

میں اپنا کھیل ہار بیٹھا ہے۔ ایک جواری کی طرح جو ایک بازی میں اپنا سب کچھ داؤں میں لگا دینے کے بعد گھنٹوں مہروں کو حرکت دیتے دیتے یکایک جب دیکھتا ہے کہ حریف نے بازی مار لی تو اس کی ساری خیالی جنتیں دھڑام سے زمین پر آرہتی ہیں۔ ذہنی طلسم بنتے بنتے وہ آناً فاناً کنگال ہو کے رہ جاتا ہے۔

ہمارے وہ ہزاروں بھائی سیاسیات سے بددل ہو کر قنوطیت کی انتہائی حالت میں مبتلا ہو گئے ہیں جنہوں نے اپنی جانیں اور اپنے مال بساطِ سیاست پر رکھ کر سالہا سال تک مہرے لڑائے۔ اور جب فیصلہ کی گھڑی آئی۔ تو انہوں نے یہ دیکھا کہ کھیل اس پر ختم ہوا کہ ان کا حریف ان کی ساری متاع کو لے اڑا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ حالات مضمحل کر دینے والے ہی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ اب ان حضرات میں یہ حوصلہ نہیں رہا کہ وہ اپنے کھیلے ہوئے کھیل پر تنقیدی نگاہ ڈالیں اور نئے سرے سے بہتر خطوط پر دوبارہ جدوجہد کریں۔

اس طرح سیاسی بازی ہارنے والوں میں بالعموم یہ بیماری پیدا ہو جایا کرتی ہے کہ وہ اپنی غلطیوں کا سارا بار دوسروں کے کندھوں پر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ثابت یہ کرتے ہیں کہ لوگ نااہل تھے اور حالات ہی ایسے نادر تھے کہ کچھ نہ کر سکے، ورنہ خود ہمارے اندر کوئی کوتاہی نہ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے غالب حریف کے دربار میں اعترافِ شکست کرنے، اس کے اقتدار کے پاسبان تک بننے پر اتر آتے ہیں۔ اور ایک وقت آتا ہے کہ اصلاح کی کوششوں کو روکنے میں ایسے ہی لوگ پیش پیش نظر آتے ہیں۔ کیونکہ قنوطی گرتا ہے تو گرتا ہی چلا جاتا ہے۔ اور اس کے گرنے کی کوئی حد نہیں ہوتی، اِلّا یہ کہ اسے بروقت امداد بہم پہنچ جائے۔

ٹھیک یہی بیماری ان تمام لوگوں میں کسی نہ کسی درجہ میں جڑیں پکڑ رہی ہے جو تقسیم ہند سے پہلے سیاست کی جنگاہ کے بڑے بڑے شہسوار ہوتے تھے۔ اور اپنے اپنے مورچوں سے دادِ شجاعت دے رہے تھے۔ لیکن تقسیم ہند نے ان کے نظریہ و اصول، ان کے مسلک اور ان کے طرزِ سیاست کا چلن بالکل ختم کر دیا۔

یہ کتنا عبرتناک منظر ہے کہ بہت سے ذہین لوگوں کی ذہانتیں، بہت سے اربابِ بصیرت

کی تصویریں، بہت سے جوانمردوں کے عزائم، بہت سے سیاسی مجاہدوں کی عمروں کی قربانیاں اپنی قیمت کھو چکی ہیں۔ اور دوسری طرف وہ لوگ جو ان کے سامنے طفلِ مکتب بھی نہ تھے جنہوں نے کوئی قربانیاں نہیں دی ہیں جنہوں نے کوئی لمبی کشمکش نہیں کی ہے، وہ آج سربراہ کاری کے نشۂ پندار سے بدمست ہیں۔ جوتنے اور بونے کی محنت کرنے میں اور لوگ لگے رہے اور فصل کاٹ کے لے گیا کوئی اور!

اب ان کا کہنا یہی ہے کہ عوام اس قابل نہیں ہیں کہ کسی اچھے مقصد کے لئے کسی ٹھوس پروگرام پر چل سکیں۔ لہٰذا بہترین مسلک تو یہی ہو سکتا ہے کہ سیاست و تمدن کی گاڑی جدھر بھی چلتی ہے اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔

واقعہ یہ نہیں ہے!

ہم اپنے ان بھائیوں کی خدمت میں جو مختلف محاذوں پر لڑتے لڑتے اس انجام کو پہنچے ہیں کہ ہمیشہ کے لئے اپنے ہتھیار رکھوا کر "صاحبِ فراش" ہو جائیں یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ آپ خدارا سنجیدگی سے اپنے سیاسی جہاد کی تاریخ کا جائزہ لیجئے! یقین جانیئے کہ اگر کسی گروہ نے کوئی صحیح اصول اور صحیح مقصد اختیار کیا ہو تو کوئی "تقسیم" اس اصول و مقصد کی قدر و قیمت کو ختم نہیں کر سکتی۔ اور کوئی مجاہد حق کے موقف پر کھڑا ہو کر باطل سے نبرد آزما رہا ہو تو اسے جان دینے پر بھی کبھی شکست نہیں ہوا کرتی۔ آپ اسے تسلیم کریں گے۔ کہ اسی دنیا میں وہ مقدس ہستیاں گذری ہیں کہ جو اس حالت میں بھی اپنے حریفوں کے مقابلے میں فاتح تھیں جبکہ ان کے سروں پہ تشدد کے آرے چل گئے جبکہ ان کی گردنوں میں پھانسی کے پھندے ڈالے گئے جبکہ ان کو آگ کے الاؤ کے حوالے کیا گیا اور جبکہ ان کو کوڑے لگائے گئے اور ان کے چہروں پر سیاہی لیپ کر ان کو مجرموں کی طرح کوچہ و بازار میں پھرایا گیا۔ یہ حضرات صرف وہ بازی جیتے ہیں جس میں جان ہے۔ ان کی ساری متاعِ حیات کھپ گئی لیکن ان کا معرکہ بازی جیت کے ان کے سامنے سے کبھی نہ اٹھا۔ انہوں نے جو جنگ لڑی اس میں نہ پیٹھ دکھانے پر تیار ہوئے۔ نہ اپنے ہتھیار رکھوا کر انہوں نے دشمن کے حوالے کئے کہ لو اب ہمیں لونڈی غلام بنا لو!

دنیا میں ناکامی صرف ان کے لئے ہوتی ہے۔ جو کسی اصل حقیقت اور کسی مثبت قدر رکھنے والے مقصد کو لے کے نہیں اُٹھتے، بلکہ ان وقتی مقاصد پر جان و مال کی بازی لگا دیتے ہیں جن کی اہمیت آج ہوتی ہے۔ تو کل نہیں ہوتی۔ جن کی قدر ایک جغرافی خط کے اس طرف ہوتی ہے۔ اس طرف نہیں ہوتی۔ اور جن سے عوام ایک حال میں دلچسپی لیتے ہیں۔ دوسرے حال میں نہیں لیتے۔ اس طرح کے مقاصد کی جنگ میں جسے فتح ہوتی ہے۔ اُسے عارضی فتح ہوتی ہے۔ اور جسے شکست ہوتی ہے وہ لازماً مایوسی و نامرادی کے غار میں جا گرتا ہے۔ ایسے مقاصد کے لئے کشمکش کر کے ناکام ہونے والوں کا بھی اور ——— بظاہر کامیاب ہونے والوں کا بھی ——— بالآخر انجام ویسا ہی ہوتا ہے جس کو کتاب اللہ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

"فمثله كمثل صفوان	سو اس کی شان ایسی ہے، جیسے صاف پتھر
عليه تراب فأصابه	ہو اس پر مٹی (کی تہ) سو پھر اس پر برسے
وابل فتركه صلدا	مینہ زور کا، اور اسے چٹیل کر کے چھوڑ جائے
لا يقدرون على شيء	
مما كسبوا"	

اسی حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے یوں واضح فرمایا ہے:۔

وقدمنا إلى ما عملوا من	اور ہم نے آلیا ان کی ہم سرگرمیوں کو جو
عمل فجعلناه هباء	انہوں نے سرانجام دی تھیں، اور پھر اسے غبار
منثورا	پریشاں بنا دیا۔

پس آج اگر آپ یہ دیکھ رہے ہیں۔ کہ آپ کی کشت کاریوں کا کوئی حاصل نہیں تو مایوس ہو کر بیٹھ رہنے کی بجائے اس پر غور کرنا چاہیئے کہ ایسا کیوں ہوا؟ ——— کہیں آپ نے اپنی جھولی میں غلط مقاصد کے بیج تو نہیں ڈالے تھے؟ اور کہیں آپ نے چٹیل زمین پر بیج تو نہیں بکھیر دیا تھا؟

کاشت کارانِ حق جو کلمۃ اللہ کا بیج جھولیوں میں ڈال کے نکلتے ہیں وہ لمبی محنت کر کے

بحالی کرتے ہیں۔ وہ کھیتی کو اپنی ہڈیوں کے چورنے کی کھاد دیتے ہیں، اور اپنے خونِ دل سے سیراب کرتے ہیں لیکن ان کی ہمیشہ زندہ رہنے والی روحیں کبھی اس سوئے ظن میں مبتلا نہیں ہوتیں کہ ان کے بوئے ہوئے بیج مر سکتے ہیں، ان کی کھپائی ہوئی محنت رائگاں جا سکتی ہے اور ان کی جانفشانیوں کا انجام ناامیدی و نامرادی ہو سکتا ہے۔ بلکہ جب وہ بیج بو رہے ہوتے ہیں۔ تو ان کی نگاہ ان چمن زاروں اور تاکستانوں پر بھی ہوتی ہے جو اس تخم ریزی کے نتیجے میں بہت آگے چل کے نمودار ہونے والے ہوتے ہیں۔

ضرورت صرف اس بات کی ہوتی ہے کہ بیج وہ لیا جائے جو مرنے والا نہ ہو، اور جب اُگے تو برگ و بار لائے، نہ کہ کانٹے بکھیرے، دوسرے یہ کہ کاشت صحیح طریقوں سے کی جائے، اور تیسرے یہ کہ "دہقان" کو یقین ہو کہ جس زمین پر محنت صرف کر رہا ہوں۔ اس کے مالک کے ہاں میری محنت محفوظ رہے گی!

ہمارے سیاسی مایوسین اگر غور کریں۔ تو وہ ماضی کا جائزہ لینے کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچیں گے۔ کہ ان تین تقاضوں کو ملحوظ رکھے بغیر انہوں نے جانفشانیاں کی ہیں۔ چنانچہ آج وہ ایک ناخوشگوار صورت حالات سے دوچار ہیں۔

سیدھی بات یہ ہے۔ کہ اگر کسی فرد یا گروہ کی جانفشانیوں کا منتہا رضائے الٰہی کا حصول ہو تو تلخ سے تلخ صورت حالات بھی اسے بد دل نہیں کر سکتی۔ اور وہ اپنی جدوجہد کو بحیثیت ایک ڈیوٹی کے سرانجام دینے میں کبھی کوتاہ کار نہیں ہو سکتا۔ اور نہ مایوسی کا کوئی احساس اس کے اندر پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ وہ مقصد ہے جس کی قدر و قیمت کبھی ضائع نہیں ہو سکتی۔ جس نے اعلائے کلمۃ اللہ پر مرتکز کر دی۔ اس کو نہ اس پہ ضد کہ کوئی ملک ایک ہے اور نہ اسے اس سے چڑ ہے کہ وہ دو یا دو سے زائد ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ پھر اسے نہ اس کی پروا کہ یہ چھٹی صدی ہجری کا دور ہے یا چودھویں صدی کا زمانہ ہے۔ پھر اسے نہ اس سے گھبراہٹ کہ سر پر جابر کا امیر یا ظالم مسلط ہے۔ یا گھر کے بتوں نے خداوندی کی جگہ لے لی ہے تو ہر حال میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری پوری کرنی ہے۔ پھر اگر اس کی دعوت پھیل نکلے۔ تو بھی اسے اطمینان کہ اس کی مزد محفوظ ہے۔ اور اگر ساری دنیا اس

کہ اسے رد کر دے یا اسے پھانسی پر لٹکا دے، تو بھی اسے اپنے مالک پر پورا بھروسہ کہ اس کا اجر اسے بہر حال مل کے رہیگا! اس کا ایمان اللہ تعالےٰ کے اس اعلان کی صداقت کی پے بہ پے گواہی دیتا ہے کہ:

ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین (پ ۱۱ ع ۴)	اللہ تعالیٰ بھلائی کی راہ اختیار کرنے والوں کی مزدوری کو ضائع نہیں جانے دیتا۔

اور:۔

ان الذین یتلون کتب اللہ و اقاموا الصلوٰۃ وانفقوا مما رزقنٰھم سرًّا و علانیۃ یرجون تجارۃ لن تبور ○ لیوفیھم اجورھم و یزیدھم من فضلہٖ انہ غفور شکور ○ (پ ۲۲ ع ۱۶)	وہ لوگ جو کتاب الٰہی کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اور نماز قائم کرتے ہیں اور خفیہ و علانیہ اس رزق میں سے راہِ حق میں صرف کرتے ہیں جو ہم نے ان کو عطا کیا ہے اور اس سوداگری پر آس لگائے بیٹھے ہیں جو کبھی خسارے میں نہیں جا سکتی —— (سمجھ لو) کہ ان کو ان کے معاوضات کے پورے پورے دیئے جائیں گے اور اللہ اپنے فضل سے اس میں اور بھی اضافہ کرے گا۔ بلاشبہ وہ (خطاؤں) کو معاف کرنے والا بھی ہے۔ اور (محنتوں کا) حق ادا کرنے والا بھی ہے!

پس ہمارے سیاسی مایوسین کو دلوں کی گہرائیوں کا جائزہ لے کر دیکھنا چاہیئے۔ کہ انہوں نے کیا فی الواقع اپنے لئے وہی کاروبار پسند کیا تھا جس میں خسارے کا کوئی امکان نہیں؟ —— اور کیا انہوں نے اپنا حساب اللہ کے بنک میں کھولا تھا جس کے دیوالیہ ہونے کا کوئی امکان نہیں؟ وہ اگر دیانتداری سے اپنے ضمیروں کے اندر اتر کے غور کریں گے تو ان پر از خود یہ واضح ہو جائے گا کہ ان کی نگاہوں نے کاروبار کے انتخاب میں بھی اور اس کے طریق کار کے انتخاب میں بھی غلطی کی ہے۔ ان کا کاروبار سیاست بہر حال دنیوی مفادات سے متعلق رہا ہے۔ اور انہوں نے اپنا پورا حساب اللہ کے

بنک میں نہیں کھولا۔ بلکہ ایسے بنکوں میں اپنا زیادہ سرمایہ لگایا ہے۔ جو دیوالیہ ہونے والے تھے اور وہ دیوالیہ ہو گئے۔

اب کیا ہو؟

اس سوال کے جواب میں صحیح مشورہ کسی خیر خواہ کی طرف سے اگر ہو سکتا ہے۔ تو صرف یہ ہے کہ ایک حوصلہ مند تاجر کی طرح جو ایک کاروبار میں ایک مرتبہ سرمایہ ڈبو دینے کے بعد ہمت ہار کے بیٹھ نہیں رہتا بلکہ بچی کھچی پونجی کو پھر سوچ سمجھ کر کسی یقینی نفع دینے والے کاروبار میں لگانے کی تدبیر کرتا ہے۔ آپ حضرات اپنے ضمیروں میں سے رہا سہا سرمایۂ عزم و اخلاص نچوڑیں اور اسے کسی منفعت بخش "کاروبار" میں لگا دیں۔ یقین جانئیے کہ ہمت ہار کر اپنی آزاد تجارت کی بساط لپیٹ دینے کے بعد آپ کے لئے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہ ہوگا کہ آپ دوسروں کے ہاں "نوکر" بھرتی ہوں۔ اور جن سے کبھی آپ کو برابری کے دعوے تھے اور جن کے سامنے کبھی سینے تان کر آپ چلا پھرا کرتے تھے، ان کے جی حضوریوں اور دست نگروں کی صفوں میں کھڑے ہوں۔ اس ذلیل حالت میں مبتلا ہونے سے بہتر یہ ہے کہ آپ ایک خوانچہ ہی لگا بیٹھیں، لیکن وہ آپ کا اپنا آزاد کاروبار ہونا چاہیئے۔ کاروبار میں خدشۂ نقصان (RISK) بہر حال ہوتا ہے۔ اور اسے برداشت کرنے کے لئے جتنی مردانگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بغیر چھوٹے سے چھوٹا کاروبار بھی نہیں چل سکتا۔ یہ خدشۂ نقصان (RISK) صرف وہ لوگ برداشت کر سکتے ہیں جن کے دلوں میں اس خدشے کے مقابلے میں امیدِ منفعت زیادہ قوی ہوتی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی تنوطی اور کوئی یاس زدہ شخص اپنے بل بوتے پر ایک روپے کا بھی کاروبار کر سکے!

آپ حضرات کا تو وہ حوصلہ تھا کہ آنکھیں بند کر کے متاعِ حیات ایک ایسے جوئے میں جھونک دی جس میں جیت کا امکان بہر حال پچاس فیصدی سے زیادہ نہ تھا۔ اور یا پھر اب یہ نامردی کہ اقامت دین کے یقینی نفع بخش کاروبار میں ایک کوڑی تک لگانے کا دل گردہ نہیں! ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا!

آپ حضرات کی یہ عجیب حالت ہے۔ کہ اگر آپ کو سرگرمیوں کے احیا کی دعوت دی جاتی ہے، کہ اُٹھیے، امیدوں کے چراغوں میں تیل ڈالئے اور آزمودہ راہوں سے بچ کر جن میں سے ہر ایک "سَوَآءَ السَّبِیْلِ" کی تعریف آئی ہے، اس صراطِ مستقیم پر چل کھڑے ہو جئیے جس پر انبیا اور صلحا کے نقوش قدم ثبت ہیں تو آپ دعوت دینے والوں کا مضحکہ اڑاتے ہیں ـــــــ جیسے ایک صاحب تجربہ بزرگ کسی ناتجربہ کار نوجوان کے خیالات کا مضحکہ اڑاتا ہے۔ آپ کردہ لوگ امحق دکھائی دیتے ہیں جو آپ کے ناتج حریفوں سے اختلاف رکھتے ہوئے حق کے غلبے کے لئے منظم طریق سے سرگرم عمل ہیں۔ آپ خود کام کرنا چھوڑ چکے ہیں لیکن جو لوگ کام کرنے کی ہمت رکھتے ہیں انکو اپنے تجربات کی روشنی میں یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ تم بھی یہ سب کچھ کر کے دیکھ لو تمہارا انجام بھی اسی طرح قنوطیت ہوگا جس طرح ہمارا ہوا۔ آپ کا مشورہ ساری دنیا کے لئے یہ ہے کہ کسی تبدیلی کی جدوجہد میں حصہ نہ لو۔ بلکہ کھاؤ، پیو، شادی بیاہ رچاؤ، بچے پیدا کرو۔ اور دنیا سے رخصت ہو جاؤ! ــــ حالانکہ اس کے برعکس خود آپ کو اپنی ناکامی کے پس منظر میں اس کے وجوہ تلاش کرنے چاہئیں۔ اور از سرِ نو اپنے لئے ایک پائدار اصول اور ایک صحیح راہِ عمل کا انتخاب کر کے حرکت میں آنے کی صورتیں نکالنی چاہئیں!

براہِ کرم اپنے ذہن پر، اپنے طرزِ فکر پر اور اپنے مشوروں پر نظرِ ثانی کیجیے ـــــ دوسروں کے لئے نہیں، اپنے فائدے کے لئے۔

اقامتِ دین کی جدوجہد جب آپ کے سامنے شروع ہوتی ہے۔ تو پھر اذانِ دعوتِ حق کی آواز کانوں میں پہنچنے کے بعد آپ کا فرض یہ ہے کہ آپ اُٹھیں اور لپک کے آئیں اور ایک سپاہی کی طرح صفِ اوّل میں آ کھڑے ہوں۔ اور اللہ کے مطالبات کے مطابق ایک طرف گردنِ بندگی کو خم کریں اور دوسری طرف خیر و شر کی جنگاہ میں پہنچ کر ولولے کے ساتھ دادِ شجاعت دیتے ہوئے نظر آئیں۔ لیکن یہ تو ایک عجیب مرض ہے۔ کہ اذان ہو رہی ہے۔ آپ حق کی پکار سن کر حالات کو رونا رونے بیٹھ جائیں۔ حق کی کامیابی کے عدمِ امکان پر دلائل لڑانا شروع کر دیں۔ اور کسی طرح ٹس سے مس نہ ہوں!

یہ حقیقت بہرحال آپ کو بتانی ہی چاہیئے کہ :۔

من اراد الاخرۃ وسعی	جس کسی نے انجامِ کار کی (بہتری) کا قصد کیا۔
لھا سعیھا وھو مؤمن	اور اس کیلئے اس کے تقاضوں کے مطابق دوڑ
فاولئک کان سعیھم	دھوپ کی بشرطیکہ وہ مؤمن ہو۔ تو ایسے لوگوں کی
مشکورا (پ ۱۵ ع ۲)	جانفشانیوں کا حق ادا کیا جائے گا

یہ وعدہ صرف اُس انجام کار ہی سے متعلق نہیں ہے، جو زندگی لعبوت میں پیش آنیوالا ہے، بلکہ عین اس مادّی دنیا کی زندگی سے بھی اس کا تعلق ہے۔ جیسا کہ دوسرے موقع پر واضح کیا گیا :

من عمل صالحا من ذکر	مردوں اور عورتوں میں سے جو کوئی عمل صالح کا پابند
او انثی وھو مؤمن	ہوا، بشرطیکہ وہ مؤمن ہو تو اسے یقیناً ہم وہ زندگی
فلنحیینہ حیوۃ طیبۃ	نصیب کریں گے جو حیات طیبہ ہو۔ اور ایسے لوگوں
ولنجزینھم اجرھم باحسن ما	کے بہترین حساب ہم لازماً چکا دیں گے ان اچھے
کانوا یعملون ؕ	اعمال کے لئے جو انہوں نے سرانجام دیئے۔

یہ ضابطہ جہاں افراد کے لئے ہے، وہاں گروہوں کے لئے بھی ہے۔ کوئی فرد یا جماعت جس نے اعلائے کلمۃ اللہ کو زندگی کی جدوجہد کا محور بنایا ہو جس نے رضائے الٰہی کے حصول کو منتہائے مقصود ٹھیرایا ہو، اور جس نے اپنی سعی و جہد کو مقصدِ حق کے تقاضوں کے مطابق صحیح حدود کا پابند رکھا ہو اس کے لئے دنیا میں بھی بھلائی ہے اور آخرت میں بھی۔ اس کی حیات بہرحال طیب ہوتی ہے اس کا قلب ہمیشہ مطمئن ہوتا ہے، اس کی رُوح ہمیشہ پُر امید ہوتی ہے ـــــ ایک کوئی شخص سے کچھ تنزل یا پستی نہیں، جہاں اسے نامرادی اور مایوسی اور قنوطیت کا سامنا کرنا پڑے۔ جس فرد اور جس جماعت نے اطمینان کھو دیا، یقین کا جوہر ضائع کر دیا۔ امید کی روشنی گم کر دی۔ اسے بہرحال یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کے نصب العین، مقصد، طریق کار میں بنیادی کمزوریاں تھیں! اگر ہمارے سیاسی مایوسین کو یہ حقیقت محسوس ہو جائے۔ تو اب بھی پانسہ پلٹ سکتا ہے

ہماری ملّت کا دوسرا بڑا قنوطی عنصر وہ ہے۔ جو محض اپنے بھُرڈلے پن کی وجہ سے بار بار دل شکستہ ہوتا ہے۔ یہ عنصر خدا اور اس کے نبی اور دینِ برحق سے وابستگی رکھتا ہے اور نہیں چاہتا کہ کوئی دوسرا دین اس کے ملک پر غالب ہو۔ اقامتِ دین کے لئے دعائیں بھی کرتا ہے حق کیلئے جدوجہد کرنیوالوں .... اور اس جدوجہد میں مصیبتوں کا سامنا کرنیوالوں سے ہمدردی بھی رکھتا ہے۔ لیکن بہرحال چونکہ اس عنصر پر مایوسی کے دَورے پَے بہ پَے پڑتے رہتے ہیں۔ اس وجہ سے اس عنصر کی قوتیں تحریکِ حق کے کام نہیں آسکتیں۔ اُلٹا اس کی قنوطیت عوام کو بزدل بناتی ہے۔

ان بھُرڈلے پن کے مریضوں کی، تین حالتیں ہیں جن میں سے ہر ایک کا بیان اشاعت آئندہ میں الگ الگ کیا جا رہا ہے۔

(باقی آئندہ)

مقالات

سود میں نئے مباحث کا اضافہ

(مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی)

(۴)

نظام سرمایہ داری کا ردِ عمل

یہ تھے وہ اصل اسباب جن کی وجہ سے صنعتی انقلاب کے پیدا کیے ہوئے نظامِ تمدن و معیشت میں خرابیاں رونما ہوئیں۔ پچھلے صفحات میں ہم نے ان کا جو تجزیہ کیا ہے اس پر غور کرنے سے یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ درحقیقت ان خرابیوں کے موجب وہ فطری اصول نہیں تھے جن کو بورژوا حضرات نے "نظام معیشت" کی تائید میں پیش کیا تھا۔ بلکہ اُن کی اصلی موجب وہ غلطیاں تھیں جو ان صحیح اصولوں کے ساتھ انہوں نے ملا دی تھیں۔

اگر بروقت ان غلطیوں کو سمجھ لیا جاتا اور اہل مغرب کو وہ حکیمانہ رہنمائی مل جاتی جس سے وہ اس نئے انقلابی دور میں ایک متوازن اور معتدل معیشت کی تعمیر کر لیتے تو اُن کے لئے بھی اور ساری دنیا کے لئے بھی صنعتی انقلاب ایک نعمت اور برکت ہوتا۔ مگر افسوس یہ ہے کہ مغربی ذہن اور کیرکٹر نے اس دور میں بھی اپنی اُنہی کمزوریوں کا اظہار کیا جو اس سے پہلے کے زمانوں میں اُس سے ظاہر ہو چکی تھیں، اور اُسی بے اعتدالی کی ڈگر پر بعد کی تاریخ بھی آگے بڑھی جس پر وہ پہلے سے بھٹک کر جا پڑی تھی۔ پہلے جس مقام پر مالکانِ زمین اور ارباب کلیسا اور شاہی خاندان تھے اب اسی ہٹ دھرمی اور ظلم و زیادتی کی جگہ بورژوا طبقہ نے سنبھال لی۔ اور پہلے حق طلبی اور شکوہ و شکایت اور غصہ و احتجاج کے جس مقام پر بورژوا حضرات کھڑے تھے، اب اُس جگہ محنت پیشہ عوام آ کھڑے ہوئے۔ پہلے جس طرح جاگیرداری نظام کے مطمئن طبقے نے اپنے بےجا امتیازات اور اپنے ناروا حقوق اور اپنی ظالمانہ قیود کی حمایت میں دین اور اخلاق اور قوانینِ فطرت کی چند صداقتوں کو غلط طریقہ سے استعمال کر کے محروم طبقوں کا

لہ مفصل بحث کے لئے دیکھئے ترجمان القرآن جلد ۳۲ عدد ۵۔

منہ بند کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب بعینہٖ وہی حرکت سرمایہ داری نظام کے مظلوم طبقوں نے شروع کر دی۔ اور پہلے جس طرح غصے اور ضد اور جھنجھلاہٹ میں آکر بورژوا لوگوں نے جاگیرداروں اور پادریوں کی اصل غلطیوں کو سمجھنے اور ان کا ٹھیک ٹھیک تدارک کرنے کے بجائے اپنی نبرد آزمائی کا بہت سا زور اُن صداقتوں کے خلاف صرف کر دیا جن کا سہارا ان کے حریف لیا کرتے تھے، اسی طرح اب محنت پیشہ عوام اور ان کے لیڈروں نے بھی غیظ و غضب میں نظر و فکر کا توازن کھو دیا اور بورژوا تمدن کی اصل خرابیوں اور غلطیوں پر حملہ کرنے کے بجائے اُن فطری اصولوں پر ہلہ بول دیا جن پر ابتدائے آفرینش سے انسانی تمدن و معیشت کی تعمیر ہوتی چلی آرہی تھی۔ متوسط طبقوں کے لوگ تو اپنی کمزوریوں اور برائیوں کے باوجود پھر کچھ ذہین اور تعلیم یافتہ ہوتے ہیں، اس لیے انہوں نے شکایت اور ضد کے جوش میں بھی تھوڑا بہت ذہنی توازن برقرار رکھا تھا۔ لیکن صدیوں کے پسے اور دبے ہوئے عوام جن کے اندر علم، ذہانت، تجربہ، ہر چیز کی کمی تھی، جب تکلیفوں سے بے قرار اور شکایات سے لبریز ہو کر بپھر گئے تو کسی بات کو قبول کرنے سے پہلے عقل و حکمت کے ترازو میں تول کر اسے دیکھ لینے کا کوئی سوال ان کے سامنے نہ رہا۔ ان کو سب سے بڑھ کر اپیل اُس مسلک نے کیا جس نے سب سے زیادہ شدت کے ساتھ ان کی نفرت اور اُن کے غصے اور ان کے انتقام کے تقاضے پورے کیے۔

یہی تقاضہ غریبوں کی جھنجھلاہٹ کا فرزندِ ارجمند جسے "سوشلزم" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے[1]۔ جدید سرمایہ داری کو پیدا ہوئے نصف صدی سے کچھ ہی زیادہ مدت گزری تھی جب وہ تولد ہوا، اور اس کی ولادت

---

[1] سوشلزم کے اصل معنی ہیں "اجتماعیت"، اور یہ اصطلاح اُس انفرادیت (Individualism) کے مقابلہ میں بنائی گئی تھی جس پر جدید سرمایہ داری کا نظام تعمیر ہوا تھا۔ اس نام کے تحت بہت سے مختلف نظریے اور مسلک کارل مارکس سے پہلے پیش کیے جانے شروع ہو گئے تھے جن کا مشترک مقصد یہ تھا کہ کوئی ایسا نظام زندگی بنایا جائے جس میں بحیثیت مجموعی پورے اجتماع کی فلاح ہو۔ لیکن وہ سب کا مذہ پڑ گئے۔ مارکس نے آکر اس طلبِ عام کا جواب ایک مذہب کے سوشلزم کی شکل میں دیا جسے "سائنٹفک سوشلزم"، "مارکسزم" اور "کمیونزم" وغیرہ مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہاں ہم اُسی سے بحث کر رہے ہیں کیونکہ زمین میں جڑ اسی نے پکڑی۔ اصطلاحات کے معاملہ میں علمی نزاکتوں کو قصداً نظر انداز کر کے ہم وہ اصطلاحیں استعمال کر رہے ہیں جن سے ہمارے عام اردو خوان لوگ یا تو پہلے ہی مانوس ہیں، یا جنہیں اردو زبان آسانی قبول کر سکتی ہے۔

پر نصف صدی سے کچھ بہت زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ اس کے ہنگاموں سے دنیا لبریز ہو گئی۔

سوشلزم اور اس کے اصول اس نئے مسلک کے مصنفوں نے اپنے حملے کی ابتدا "حقوق ملکیت" سے کی۔ انہوں نے کہا کہ اصل خرابی کی جڑ یہی بلا ہے۔ پہننے کے کپڑے، استعمال کے برتن، گھر کا فرنیچر اور اس طرح کی دوسری چیزیں تو ضرور انفرادی ملکیت میں رہنی چاہئیں، مگر یہ زمین اور مشین، اور آلات اور دوسری ایسی چیزیں جن سے دولت کی پیداوار ہوتی ہے، ان پر افراد کے مالکانہ حقوق ہرگز قائم نہ رہنے چاہئیں۔ اس لئے کہ جب ایک شخص ان میں سے کسی چیز کا مالک ہوگا تو دولت پیدا کرے گا۔ دولت پیدا کرے گا تو جمع کرے گا۔ جمع کرے گا تو پھر کچھ اور زمین یا مشین خرید کر پیدائش دولت کے ذرائع میں اضافہ کر لے گا۔ اضافہ کرے گا تو دوسرے آدمیوں سے تنخواہ، یا مزدوری، یا لگان کا معاملہ طے کر کے ان سے کام لے گا۔ اور جب یہ کرے گا تو لامحالہ پھر وہ سب کچھ کرے گا جو آج کل سرمایہ دار کر رہا ہے۔ لہٰذا سرے سے اس جڑ ہی کو کاٹ دو جس سے یہ بلا پیدا ہوتی ہے۔ پروانے کی جان بچانی ہے تو شمع کو باغ میں جانے ہی نہ دو!

سوال پیدا ہوا کہ اشیاء استعمال کے حقوقِ ملکیت کی طرح ذرائع پیداوار کے حقوق ملکیت بھی کوئی آج کی نئی چیز تو نہیں ہیں جنہیں بورژوا سرمایہ داروں نے تصنیف کر لیا ہو، یہ تو وہ بنیادیں ہیں جن پر قدیم ترین زمانے سے انسانی معیشت و تمدن کی عمارت تعمیر ہوتی چلی آرہی ہے۔ ایسی چیز کے اکھاڑ پھینکنے کا فیصلہ آخر یوں سرسری طور پر کیسے کر ڈالا جائے؟ جواب میں فی البدیہہ ایک پوری تاریخ گھڑ دی گئی کہ انسانیت کے آغاز میں ذرائع پیداوار پہ انفرادی ملکیت کے حقوق تھے ہی نہیں۔ یہ تو بعد میں طاقت ور طبقوں نے اپنی خود غرضی سے قائم کر لیے۔

کہا گیا، ان حقوق کو تو سارے مذاہب، تمام اخلاقی نظام، دنیا بھر کے قوانین ہمیشہ سے مانتے رہے ہیں۔ اُن میں سے کسی نے بھی یہ نظریہ اختیار نہیں کیا کہ معیشت و تمدن کی وہ صورت بجائے خود غلط ہے جو ذرائع پیداوار کی انفرادی ملکیت سے بنتی ہے ـــــ جواب میں ایک لمحہ کے تامل کے بغیر دعویٰ کر دیا گیا کہ مذہب، اخلاق اور قانون تو ہر زمانہ کے غالب طبقوں کے آلۂ کار رہے ہیں۔ پیدائشِ دولت کے ذرائع پر جن طبقات کا اجارہ قائم ہو گیا انہیں اپنے اس اجارے کو محفوظ اور مضبوط کرنے کے لئے کچھ نظریات، کچھ اصولوں اور کچھ رسموں اور ضابطوں کی حاجت لاحق ہوئی، اور جن لوگوں نے یہ چیزیں ان کی اغراض کے مطابق بنا کر پیش کر دیں وہ پیغمبر اور رشی

اور انہیں اخلاق اور شارع و مقنن قرار دے دیئے گئے۔ محنت پیشہ طبقے بہت مدت تک اس طلسم فریب کے شکار رہے، اب وہ اسے توڑ کر رہیں گے!

اعتراض ہوا کہ ان حقوق کو مٹانے اور ختم کرنے کے لئے تو ایک ایسی سخت نزاع برپا کرنی پڑے گی جس میں ہر قوم کے مختلف عناصر آپس ہی میں گتھ جائیں گے اور قریہ قریہ اور بستی بستی میں طبقاتی جنگ کی آگ بھڑک اٹھے گی۔ جواب میں کچھ دیر نہ گزری تھی کہ ایک پورا فلسفۂ تاریخ گھڑ کر رکھ دیا گیا جس میں ثابت کیا گیا کہ انسانی تمدن کا تو سارا ارتقاء ہی طبقاتی جنگ کے ذریعہ سے ہوا ہے۔ اس راستہ کے سوا ارتقاء کا اور کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔

پھر اعتراض ہوا کہ اپنے ذاتی نفع کے لئے کام کرنا تو انسان کی فطرت اور جبلت میں پیوست ہے اور ہر انسان ماں کے پیٹ سے یہی میلان لئے ہوئے پیدا ہوتا ہے۔ تم جب افراد سے ذرائع پیداوار کی ملکیت چھین لوگے اور ان کے لئے یہ موقع باقی ہی نہ رہنے دوگے کہ وہ جتنی کوشش کریں اتنا نفع حاصل کرتے چلے جائیں، تو ان کے اندر کوشش کرنے کا جذبہ ہی نہ پیدا ہوگا اور یہ چیز بالآخر انسانی تہذیب و تمدن کے لئے برباد کن ثابت ہوگی ——— اس پر چھوٹتے ہی برملا جواب دیا گیا فطرت؟ جبلت؟ موروثی میلانات؟ یہ کیا بورژوا پن کی باتیں کرتے ہو۔ انسان کے اندر ان ناموں کی کوئی چیز سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ اس کے تو سارے رجحانات صرف اجتماعی ماحول کی پیداوار ہیں۔ ایک ماحول کو بدل کر دوسرا ماحول پیدا کر دو، اس کا دماغ دوسری طرح سوچنے لگے گا، اس کا دل دوسری قسم کے جذبات کی آماجگاہ بن جائے گا، اس کے نفس سے کچھ اور ہی میلانات کی تراوش شروع ہو جائے گی۔ جب تک انفرادی ملکیت کا نظام قائم ہے، لوگ "انفرادی الذہن" ہیں۔ جب اجتماعی ملکیت کا نظام قائم ہو جائے گا یہی سب لوگ "اجتماعی الذہن" ہو جائیں گے۔

پوچھا گیا، انفرادی ملکیت ختم کر کے آخر سارا معاشی کاروبار چلایا کیسے جائے گا؟ ——— جواب ملا تمام ذرائع پیداوار (زمین، کارخانے، اور ہر قسم کے تجارتی و صنعتی ادارے) افراد کے قبضے سے نکال کر قومی ملکیت بنا دیئے جائیں گے، جو لوگ ان اداروں میں کام کریں گے انہی میں ان کے منافع تقسیم ہو جائیں گے، اور ان کارکنوں کے ووٹوں سے ہی وہ منتظمین منتخب ہوا کریں گے جن کے ہاتھ میں اس ساری معیشت کا انتظام ہوگا۔

سوال اٹھا، جو لوگ اس وقت زمینوں اور کارخانوں اور دوسرے ذرائع پیداوار کے مالک ہیں ان کی ملکیت

ختم کرنے اور اجتماعی ملکیت قائم کرنے کی صورت کیا ہو گی؟ ـــــ اس سوال کے دو مختلف جواب دیئے گئے۔

ایک مسلک والوں نے جواب دیا اس تغیر کے لئے جمہوری طریقے اختیار کیے جائیں گے، رائے عام کو ہموار کر کے سیاسی اقتدار پر قبضہ کیا جائے گا، اور قانون سازی کے ذریعہ سے بتدریج زرعی جائدادوں، صنعتوں اور تجارتوں کو بعض حالات میں بلا معاوضہ اور بعض حالات میں معاوضہ ادا کر کے اجتماعی ملکیت بنا لیا جائیگا۔ یہی لوگ ہیں جن کے لئے اب بالعموم "سوشلسٹ" کا لفظ مخصوص ہو گیا ہے۔ اور کبھی کبھی ان کے مسلک کو "ارتقائی سوشلزم" بھی کہتے ہیں۔

دوسرے مسلک والوں نے کہا جمہوری طریقوں سے یہ تغیر نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے تو انقلابی طریق کار ناگزیر ہے۔ نادار و محنت پیشہ عوام کو منظم کیا جائے گا۔ ملکیت رکھنے والے طبقوں کے خلاف ہر ممکن طریقہ سے جنگ کی جائیگی۔ بورژوا حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے گا۔ مزدوروں کی ڈکٹیٹرشپ قائم کی جائیگی۔ مالکان زمین سے ان کی زمینیں اور کارخانہ داروں سے ان کے کارخانے اور تاجروں سے ان کی تجارتیں بزور دستی چھین لی جائیگی۔ جو مزاحمت کرے گا اسے فنا کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ سارے طبقات کو ختم کر کے تمام آبادی کو ایک طبقہ (یعنی اپنے ہاتھ سے کام کر کے روٹی کمانے والا طبقہ) بنا دیا جائے گا۔ اور از روئے قانون یہ چیز حرام کر دی جائیگی کہ ایک شخص دوسرے شخص یا اشخاص سے اجرت پر کام لے اور اس کام کا نفع کھائے۔ پھر جب یہ انقلاب مکمل ہو جائے گا اور سرمایہ دار طبقات کے از سر نو جی اٹھنے کا کوئی خطرہ باقی نہ رہے گا تو یہ ڈکٹیٹرشپ آپ سے آپ (خدا جانے کس طرح) سوکھ کر جھڑ جائے گی اور خود بخود (نہ معلوم کیسے) ایک ایسا نظم اس کی جگہ لے لے گا جس میں حکومت اور جبر کے بغیر زندگی کے سارے شعبے لوگوں کی باہمی رضامندی، مشاورت اور تعاون سے چلتے رہیں گے۔ اس دوسرے مسلک کا نام "انقلابی سوشلزم" ہے۔ اسی کو بولشوزم کے نام سے بھی یاد کیا جاتا رہا ہے۔ اسی کو مارکسزم بھی کہتے ہیں۔ مگر اب دنیا اسکو زیادہ تر "کمیونزم" کے مشہور و معروف نام سے جانتی ہے۔

ستر اسی سال تک سوشلزم کا یہ نیا مسلک اپنی بے شمار شاخوں اور اپنے مختلف الاقسام مذاہب فکر کے ساتھ یورپ اور اس کے زیر اثر ملکوں میں پھیلتا رہا۔ ابتداءً یہ چند سر پھروں کی ایک نرالی اپج تھی جس کے

مقدمات اور دلائل اور نتائج، سب قطعی رہل تھے اور صرف غضبناک مزدوروں ہی میں اسکو علم و عقل کی بنا پر نہیں بلکہ بھڑکے ہوئے جذبات کی بنا پر مقبولیت حاصل ہو رہی تھی۔ لیکن مغربی ذہن کی دلچسپ کمزوریوں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ "اپج" کو بہت پسند کرتا ہے، خصوصاً جب کہ وہ نہایت لغو ہو اور اس کا پیش کرنے والا بے دھڑک اور بے جھجک ہو کر بڑے سے بڑے مسلمات کو کاٹتا چلا جائے اور اپنے دعاوی کو ذرا سا "سائنٹفک" طریقہ سے اتنا مرتب کرے کہ ان کے اندر ایک "سسٹم" پیدا ہو جائے۔[1] یہ خصوصیات اس "سائنٹفک سوشلزم" میں بدرجۂ تم پائی جاتی تھیں۔ اسی وجہ سے نچلے متوسط طبقے کے بہت سے ذہین لوگ اور خود بورژوا طبقہ میں سے بعض سنکی اور بعض ہوشیار لوگ اس مسلک کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اسکی شرح و تفسیر اور دعوت و تبلیغ میں کتابوں، رسالوں اور اخباروں کے ڈھیر لگنے شروع ہو گئے۔ دنیا بھر کے ملکوں میں مختلف سوشلسٹ نظریات کی حامی پارٹیاں منظم ہو گئیں، اور آخر کار انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد سنجیدگی کے ساتھ یہ سمجھنے لگی کہ ان نظریات پر ایک نظام تمدن و معیشت تعمیر ہو سکتا ہے۔

کمیونزم اور اس کا میزانیۂ نفع و نقصان جہاں تک ارتقائی سوشلزم کا تعلق ہے اس نے تو ابھی دنیا میں اپنا کوئی نمونہ پیش نہیں کیا ہے جس کو دیکھ کر ہم پورے طور پر معلوم کر سکیں کہ اس کا طریق کار کس طرح انفرادی سرمایہ داری کے نظام کو اجتماعیت میں تبدیل کرے گا اور اس سے کیا نتائج برآمد ہوں گے۔ اس لیئے ہم اسکو چھوڑ کر یہاں انقلابی اشتراکیت یعنی کمیونزم کے کارنامے کا جائزہ لیں گے جس نے ۱۸-۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم اول سے فائدہ اٹھا کر روس میں فی الواقع ایک انقلاب برپا کر دیا اور اپنے نظریات کے مطابق ایک پورا نظام تمدن قائم کر ڈالا۔[2]

---

[1] یہ بات کسی جغرافی تعصب کی بنا پر نہیں کہی جا رہی ہے۔ مشرق میں جو مغرب زدہ ذہن پیدا ہوا ہے اس کا حال اس سے بھی زیادہ بدتر ہے۔ مغربی ذہن پھر غنیمت ہے کہ کچھ "اپج" کی بات دیکھ کر اس پر ریجھتا ہے اور ایک سسٹم اور سائنٹفک طرز کو تو پسند کرتا ہے۔ مگر یہاں وہ غلام ذہن جنم لے رہا ہے جس کو مرعوب و متاثر کرنے والی اصل چیز صرف یہ ہوتی ہے کہ بات مغرب کے کسی امام کی کہی ہوئی ہے۔

[2] واضح رہے کہ سوشلزم اور کمیونزم میں فرق صرف طریق کار کا ہے۔ رہا اصول کہ ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنا دیا جائے، تو وہ دونوں میں مشترک ہے۔ اس نئے طریقہ کی بحث کو الگ کر کے ذرائع پیداوار کو قومی بنانے کے فوائد اور نقصانات پر جو کچھ بھی گفتگو کی جائیگی وہ ان دونوں مسلکوں پر چسپاں ہوگی۔

روسی اشتراکیت چونکہ پچھلے کئی سال سے سخت مباحثوں اور مناظروں کا موضوع بنی رہی ہے، اس لئے اسکی میزانِ نفع و نقصان بنانے میں اس کے حامیوں اور مخالفوں، دونوں کی طرف سے بڑی کھینچ تان ہوتی رہتی ہے۔ اس کے حامی اُس کے نفع کے پہلو میں بہت سی ایسی چیزوں کو داخل کر دیتے ہیں جو درا صل اشتراکیت کے منافع نہیں ہیں بلکہ قابل اور مستعد لوگوں کے ہاتھ میں انتظام ہونے کے ثمرات ہیں۔ دوسری طرف اس کے مخالف اس کے نقصان کے پہلو میں بہت سی اُن خرابیوں کو رکھ دیتے ہیں جو بجائے خود اشتراکیت کے نقصانات نہیں بلکہ ظالم اور تنگ ظرف افراد کے برسر اقتدار آجانے کے نتائج ہیں۔ اشتراکی روس کے حامیوں کا یہ طریقہ کہ وہ عہد زار کے روس کی خستہ حالی، جہالت اور پسماندگی سے موجودہ روس کی علمی، ذہنی، صنعتی اور تمدنی حالت کا مقابلہ کرتے ہیں، اور حاصلِ جمع و تفریق میں جتنی ترقی نکلتی ہے اس سب کو اشتراکیت کی برکات کے خانے میں درج کر دیتے ہیں، اصولاً کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ تیس بتیس سال کی مدت میں جتنی کچھ بھی ترقی روس نے کی ہے اس کا مقابلہ اگر امریکہ، جاپان، یا جرمنی کے ایسے ہی تیس بتیس سال سے کیا جائے تو شاید تناسب کچھ زیادہ ہی نکلے گا۔ مثلاً ۱۸۷۰ء میں جاپان تعلیم اور صنعت و حرفت اور قدرتی وسائل کے استعمال اور پیداوار دولت کے لحاظ سے کیا کچھ تھا اور ۱۹۰۴ء میں جب اس نے روس کو شکست دی تو وہ ان حیثیات سے کس مرتبے پر پہنچ گیا تھا۔ یا ۱۸۷۰ء میں جرمنی کی حالت کیا تھی اور بیسویں صدی کے آغاز تک پہنچتے پہنچتے اس کے باشندے علمی و ذہنی حیثیت سے اور اس کے معاشی وسائل اپنی پیداوار کے لحاظ سے کہاں جا پہنچے تھے۔ اگر ان ترقیات کا اتنی ہی مدت کی روسی ترقیات سے موازنہ کر کے دیکھا جائے تو روس کے حساب میں آخر کتنا سرمایۂ افتخار نکلے گا؟ پھر کیا یہ اصول مان لیا جائے کہ ایک ملک نے ایک خاص زمانہ میں اگر کچھ غیر معمولی ترقی کی ہو تو اسکی ساری تعریف اُن اصولوں کے حق میں لکھ دی جائے جن پر اس ملک کا نظام تمدن و معیشت و سیاست قائم ہو؟ حالانکہ بسا اوقات اجتماعی زندگی کا سارا کارخانہ غلط اصولوں پر چل رہا ہوتا ہے مگر رہنماؤں کی انفرادی خوبیاں اور ان کے مددگاروں کی عمدہ صلاحیتیں بڑے شاندار نتائج پیدا کر دکھاتی ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اشتراکی روس کی جن خرابیوں کا حوالہ اس کے مخالفین دیتے ہیں اُن میں بھی بہت سی خرابیاں وہ ہیں جو کم و بیش اس طریقہ پر غیر اشتراکی جباروں کی فرمانروائی میں بھی پائی جاتی ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم

ان سب کو پرے افراد کے حساب میں سے نکال کر اُس اصول کے حساب میں ڈال دیں جس پر اُن کا نظام تمدن و معیشت قائم ہوا ہے ؟

فوائد جو متعلق چیزوں کو الگ کر کے جب ہم اصل اشتراکیت کے اس کارنامے پر نگاہ ڈالتے ہیں جو روسی تجربہ کی بدولت ہمارے سامنے آیا ہے ، تو نفع کے خلنے میں ہم کو یہ چیزیں ملتی ہیں :-

(۱) افراد کے قبضہ سے زمین ، کارخانے اور تمام کاروبار نکال لینے کا یہ فائدہ ہوا کہ اشیاء کی لاگت اور ان کی بازاری قیمت کے درمیان جو منافع پہلے زمیندار ، کارخانہ دار اور تاجر لیتے تھے وہ اب حکومت کے خزانے میں آنے لگا اور یہ ممکن ہو گیا کہ اس منافع کو اجتماعی فلاح کے کاموں پر صرف کیا جا سکے۔

(۲) تمام ملک کے ذرائع پیداوار ایک ہی نظم و نسق کے قبضہ میں آجانے سے یہ ممکن ہو گیا کہ ایک طرف ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے مطابق ان سب کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینے اور زیادہ سے زیادہ مفید طریقے سے استعمال کرنے کی کوشش کی جائے اور دوسری طرف سارے ملک کی ضروریات کو سامنے رکھ کر انہیں پورا کرنے کی منظم تدابیر عمل میں لائی جائیں۔

(۳) سارے وسائل دولت پر قابض ہو کر جب حکومت ایک جامع منصوبہ بندی کے مطابق ان کو چلانے لگی تو اس کے لئے یہ بھی ممکن ہو گیا کہ ملک کے تمام قابلِ کار آدمیوں کو کام پر لگائے اور یہ بھی کہ وہ ان کو ایک سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق تعلیم و تربیت دے کر اس طرح تیار کرے کہ اجتماعی معیشت کے لئے جن پیشوں اور خدمات کے لئے جتنے آدمی درکار ہیں اتنے ہی وہ تیار کیئے جاتے رہیں۔

(۴) اوپر نمبر ایک میں زراعت ، صنعت اور تجارت کے جس منافع کا ذکر کیا گیا ہے وہ جب حکومت کے ہاتھ میں آگیا تو وہ اس قابل ہو گئی کہ اس منافع کا ایک حصہ "سوشل انشورنس" کے انتظام پر صرف کرے۔ سوشل انشورنس کا مطلب یہ ہے کہ تمام ملک میں جو لوگ کام کرنے کے قابل نہ ہوں ، یا عارضی یا مستقل طور پر ناقابلِ کار ہو جائیں ، یا بیماری ، زچگی اور دوسرے مختلف حالات کی وجہ سے جن کو مدد کی ضرورت پیش آئے ان کو ایک مشترک خزانے سے مدد دی جائے۔

نقصانات کوئی شک نہیں کہ بے قید معیشت سے جو بیماریاں پیدا ہوئی تھیں ، اس آپریشن نے ان کا خوب ہی

کامیاب علاج کیا۔ مگر روس کو اسکی قیمت کیا دینی پڑی ؟ اور پچھلی بیماریوں کو دور کرنے کے لئے دوسری کیا بیماریاں اس نے مول لیں ؟ آیئے اب ذرا اس کا جائزہ بھی لے لیں۔

(۱) افراد کے قبضہ سے زمینوں، کارخانوں اور تمام دوسرے ذرائع پیداوار کو نکالنا اور ان ساری چیزوں کو اجتماعی ملک بنا دینا بہرحال کوئی کھیل نہ تھا کہ بس ہنسی خوشی انجام پاگیا ہو۔ یہ ایک بڑا ہی سخت کام تھا جو برسوں کے مسلسل نہایت ہولناک ظلم وستم کرنے سے پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ ہر شخص خود ہی قیاس کرسکتا ہے کہ آپ لاکھوں آدمیوں کو ان کی چھوٹی بڑی املاک سے زبردستی بے دخل کرنے پر تل جائیں تو وہ بآسانی آپ کے اس فیصلہ کے آگے سرِ تسلیم خم نہ کردیں گے۔ یہ کام جب اور جہاں بھی ہوگا سخت کشت وخون ہی سے ہوگا۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ اس اسکیم کو عمل میں لانے کے لئے تقریباً ۱۰ لاکھ آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا، ۲۰ لاکھ آدمیوں کو مختلف قسم کی سخت سزائیں دی گئیں۔ اور چالیس پچاس لاکھ آدمیوں کو ملک چھوڑکر دنیا بھر میں تتر بتر ہوجانا پڑا۔ صرف ایک اجتماعی زراعت کی اسکیم نافذ کرنے کے لئے لاکھوں چھوٹے چھوٹے اور متوسط زمینداروں (Kulaks) کو جس بے دریغ طریقہ سے فنا کیا گیا اس پر تو خود روس کے پرجوش حامی بھی چیخ اٹھے۔

(۲) جو لوگ تمام دنیا کے مسلّم مذہبی، اخلاقی اور قانونی اصولوں کے مطابق اپنی املاک کے جائز مالک ہوں انہیں اگر آپ اپنی ایک خود ساختہ اور نرالی اسکیم نافذ کرنے کے لئے زبردستی ان کی ملکیتوں سے بے دخل کرنا چاہیں گے تو لامحالہ آپ کو نہ صرف اُن تمام مذہبوں اور اخلاقی اصولوں کا جو آپ کے نظریے کے خلاف ہیں، انکار کرنا پڑے گا، بلکہ ملکیتوں کے ساتھ ساتھ ان کی بھی بیخ کنی پر اپنی ساری قوت لگادینی ہوگی۔ مزید برآں اپنی اس اسکیم کو ہر قسم کی بے دردی اور شقاوت، ظلم، جھوٹ اور فریب سے نافذ کرنے کے لئے آپ مجبور ہوں گے کہ سرے سے ایک نیا ہی نظریۂ اخلاق وضع کریں جس کے تحت ہر ظلم وجبر اور ہر بے دردی وسنگ دلی کا ارتکاب جائز ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکی لیڈروں اور کارکنوں نے اپنے پیش نظر انقلاب کو عمل میں لانے کے لئے خدا اور مذہب کے خلاف سخت پراپیگنڈا کیا، اور بورژوا طبقہ کے ساتھ ساتھ مسلمانوں اور عیسائیوں کے مذہبی طبقوں کو بھی بڑی سختی سے کچلا، اور اخلاق کا ایک نیا نظریہ پیدا کیا جو لینن کے الفاظ میں یہ ہے:-

"ہم ہر اُس اخلاق کو رد کرتے ہیں جو عالم بالا کے کسی تصور پر مبنی ہو، یا ایسے خیالات سے ماخوذ

ہو جو طبقاتی تصورات سے ماوراء ہیں۔ ہمارے نزدیک اخلاق قطعی اور کلی طور پر طبقاتی جنگ کا تابع ہے۔ ہر وہ چیز اخلاقاً بالکل جائز ہے جو پرانے نفع اندوز اجتماعی نظام کو مٹانے کیلئے اور محنت پیشہ طبقوں کو متحد کرنے کے لئے ضروری ہو۔ ہمارا اخلاق بس یہ ہے کہ ہم خوب منضبط اور منظم ہوں اور نفع گیر طبقوں کے خلاف پورے شعور کے ساتھ جنگ کریں۔ ہم یہ ماننے ہی نہیں کہ اخلاق کے کچھ ازلی وابدی اصول بھی ہیں۔ ہم اس فریب کا پردہ چاک کر کے رہیں گے۔ اشتراکی اخلاق اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مزدوروں کی مطلق العنان حکومت کو مضبوطی کے ساتھ قائم کرنے کے لئے جنگ کی جائے۔"

یہ دوسری بھاری قیمت تھی جو سرزمین روس کو اشتراکی نظام کے لئے دینی پڑی۔ یعنی صرف ایک کروڑ آدمیوں کی زندگی ہی نہیں، بلکہ اس کے ساتھ دین، ایمان، اخلاق، انسانیت، شرافت، اور وہ سب کچھ جو ایک انوکھی اسکیم کو جبر وظلم سے نافذ کرنے میں مانع تھا۔

(۳) ہم خود اپنے ملک میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں کہ جب ایک طرف عام اخلاقیات کے بند ڈھیلے ہوتے ہیں، اور دوسری طرف مختلف ضروریاتِ زندگی پر سرکاری کنٹرول نافذ کر دیا جاتا ہے تو رشوت، خیانت اور غبن کا سلسلہ بے تحاشا چل پڑتا ہے اور زندگی کی جو ضرورت بھی پرمٹ، لائسنس، راشن کارڈ یا کوٹا ملنے پر موقوف ہو جاتی ہے اسی کے معاملے میں پبلک کو ہر طرح تنگ ہونا پڑتا ہے اور سرکاری آدمیوں کے وارے نیارے ہونے لگتے ہیں۔ اب خود اندازہ کر لیجئے کہ جہاں ایک طرف سارے ہی اخلاقی صفات کی جڑیں ہلا ڈالی گئی ہوں، اور اخلاق کا یہ اصول لوگوں کے ذہن نشین کر دیا گیا ہو کہ جو کچھ مفید مطلب ہے وہی حق اور صدق ہے، اور ملک کے رہنماؤں نے خود بدترین قسم کے ظلم وستم کر کے اس نئے اخلاق کے شاندار نمونے دکھا دیئے ہوں، اور جہاں دوسری طرف ضرورت کی صرف چند چیزیں ہی نہیں بلکہ ملک کی پوری ہی معاشی دولت اور سارے ہی وسائلِ زندگی سرکاری کنٹرول میں ہوں، وہاں رشوت، خیانت، غبن اور عام مردم آزاری کی کیسی کچھ گرم بازاری ہوگی۔ یہ معاملہ صرف قیاس کی حد تک نہیں ہے۔ روس کے "آہنی پردے" سے چھن چھن کر جو خبریں وقتاً فوقتاً باہر آجاتی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہاں عمالِ حکومت اور مختلف معاشی اداروں کے ارباب انتظام نے

بدکرداری (Corruption) کا ایک اچھا خاصا سخت مسئلہ پیدا کر دیا ہے۔ درحقیقت وہاں اس مسئلے کا پیدا ہونا قابل تعجب نہیں ہے بلکہ نہ ہونا تعجب کے قابل ہوتا۔ ایک نظام کو تم بداخلاقی کے زور سے توڑ بھی سکتے ہو اور دوسرا نظام بداخلاقی کے زور سے قائم بھی کر سکتے ہو، لیکن کسی نئے نظام کو بداخلاقی کے بل بوتے پر چلائے جانا سخت مشکل ہے۔ اسے ٹھیک ٹھیک چلانے کے لئے بہرحال عمدہ اور مضبوط سیرت کے آدمیوں کی ضرورت ہے اور اس کا سانچہ تم خود پہلے ہی توڑ چکے ہو۔

(۴) انفرادی ملکیتوں کو ختم کر کے اجتماعی ملکیت کے اصول پر ملک کے معاشی نظام کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے سب سے بڑھ کر جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ لوگوں کے اندر سے خود غرضی اور ذاتی نفع کی طلب نکال دی جائے اور ان صفات کے بجائے اُن کے ذہن پر مجموعی بھلائی کے لئے کام کرنے کا جذبہ اتنا غالب کر دیا جائے کہ وہی ان کے اندر اصل محرک عمل بن جائے۔ اشتراکیوں کا دعوئے یہ تھا کہ انسانی فطرت اور جبلت اور موروثی میلانات محض بورژوا فلسفہ و سائنس کے ڈھکوسلے ہیں۔ اس نام کی کوئی چیز انسان کے اندر موجود نہیں ہے۔ ہم ذاتی نفع طلبی اور خود غرضی کے میلانات لوگوں میں سے نکال ڈالیں گے اور ماحول کے تغیر سے اجتماعی ذہنیت ان میں پیدا کریں گے۔ لیکن اس بے بنیاد دعوے کو عملی جامہ پہنانے میں اشتراکی حضرات قطعی ناکام ہو چکے ہیں۔ وہ اپنے ملک کے عوام اور اپنے نظام معیشت و تمدن کے کارفرماؤں اور کارکنوں میں حقیقی اجتماعی ذہنیت اس مقدار سے ایک ماشہ بھر بھی زیادہ نہیں اُبھار سکے جتنی ہر سوسائٹی کے لوگوں میں فطرۃً موجود رہتی ہے۔ وہ ان کے اندر سے خود غرضی و نفع طلبی کو نکال دینا تو درکنار، اسے کم بھی نہ کر سکے، بلکہ انہیں تھک ہار کر آخر کار اسے سیدھی طرح تسلیم کرنا پڑا اور لوگوں سے کام لینے کے لئے ان کی خود غرضی ہی کو اپیل کرنا پڑا۔ اس حد تک تو خیر وہ بورژوا نظام زندگی کے برابر رہے۔ مگر جس چیز نے ان کو بورژوا نظام سے بھی زیادہ خرابی میں مبتلا کیا وہ یہ ہے کہ جب انہوں نے افراد کی نفع طلبی کے لئے زراعت، صنعت، تجارت اور دوسرے فائدہ مند کاروبار کے فطری راستے بند کر دیئے، اور مصنوعی پروپیگنڈا کے ذریعہ سے اس نفع طلبی کے صاف اور سیدھے اور معقول مظاہر کو خواہ مخواہ معیوب ٹھیرا دیا، تو یہ جذبہ اندر دب گیا، اور اب ان کے تمام دوسرے دبے ہوئے جذبات کی طرح اس نے بھی منحرف (Perverted) ہو کر اپنے ظہور کے لئے ایسی منحرف راہیں نکال لیں جو سوسائٹی کی جڑیں اندر ہی اندر کھوکھلی کر رہی ہیں۔ اشتراکی معاشرے

میں رشوت، خیانت، چوری، غبن اور اسی طرح کی دوسری برائیوں کے بڑھنے میں اس چیز کا بھی بڑا دخل ہے۔ وہاں اگر کوئی چیز ممنوع ہے تو صرف یہ کہ ایک آدمی اپنی کمائی ہوئی دولت کو مزید دولت پیدا کرنے والے کسی کاروبار میں لگائے۔ اس کے سوا دولت کے سارے مصرف اسی طرح کھلے ہوئے ہیں جس طرح ہماری سوسائٹی میں ہیں۔ ایک آدمی اپنے لباس، خوراک، مکان، سواری، فرنیچر اور سامان عیش و عشرت پر جتنا چاہے روپیہ خرچ کر سکتا ہے، اپنا معیار زندگی جتنا چاہے بلند کر سکتا ہے، عیاشی و خوش باشی کی وہ ساری ہی صورتیں دل کھول کر اختیار کر سکتا ہے جو مغربی سوسائٹی میں مباح ہیں، اس سے جو روپیہ بچے اُسے جمع کر سکتا ہے، اس جمع کردہ دولت کو براہ راست خود تو نہیں مگر حکومت کے ذریعہ سے کاروبار میں بھی لگا سکتا ہے اور اس پر آٹھ دس فیصدی سالانہ تک سود پا سکتا ہے، اور جب مرنے لگے تو اس جمع شدہ دولت کو اپنے وارثوں کے لئے چھوڑ جا سکتا ہے۔

(۵) اس قدر کشت و خون اور کھیڑ پچھاڑ اور اتنے بڑے پیمانے پر دین و اخلاق و انسانیت کی بربادی جس غرض کے لئے برداشت کی گئی تھی وہ یہ تھی کہ اشیاء کی لاگت اور ان کی بازاری قیمت کے درمیان جو منافع صرف زمیندار اور کارخانہ دار اور تاجر طبقے کھا جاتے ہیں۔ وہ چند مخصوص طبقوں کی جیب میں جانے کے بجائے پوری سوسائٹی کے خزانے میں آئے اور سب پر برابری کے ساتھ، یا کم از کم انصاف کے ساتھ تقسیم ہو۔ یہی انفرادی ملکیتوں کو ختم کرنے کی اصل غرض تھی اور یہی، اگر حاصل ہوتی تو اسے اجتماعی ملکیت کا اصلی فائدہ کہا جا سکتا تھا۔ مگر کیا واقعی یہ مقصد پورا ہوا؟ ذرا تجزیہ کر کے دیکھئے کہ انفرادی ملکیتوں کو ختم کرنے سے زراعت، صنعت اور تجارت کے جو منافع اجتماعی خزانے میں آ رہے ہیں وہ تقسیم کس طرح ہوتے ہیں:-

الف۔ حکومت کے تمام شعبوں اور معاشی کاروبار کے تمام اداروں میں ادنیٰ ملازمین اور اعلیٰ عہدہ داروں کے درمیان معاوضوں میں اُتنا ہی فرق ہے جتنا کسی بورژوا سوسائٹی کے اندر پایا جاتا ہے۔ ایک طرف ایک عام کارکن کی تنخواہ اور اس کی زندگی کا معیار امریکہ و انگلستان کے مزدوروں کی بہ نسبت بہت پست ہے اور ہندوستان و پاکستان کے معیار سے اگر کچھ اونچا ہے تو کچھ بہت زیادہ نہیں۔ دوسری طرف ڈائرکٹروں اور منیجروں اور حکومت کے عہدہ داروں اور فوجی افسروں اور انجینئروں اور ایکٹرسوں اور مصنفین و مولفین وغیرہ کی آمدنیاں بڑھتے بڑھتے کئی کئی لاکھ روبل سالانہ تک پہنچ گئی ہیں۔ گویا اگر پوری طرح نہیں تو ایک بڑی حد تک یہ تجارتی و صنعتی منافع اونچے اور نیچے

طبقوں کے درمیان اسی نامساوی طریقہ سے تقسیم ہو رہا ہے جس طرح پہلے محنت پیشہ مزدوروں اور بورژوا لوگوں کے درمیان ہوتا تھا۔

ب۔ پھر اشتراکی انقلاب برپا کرنے کے لئے محنت پیشہ عوام اور بورژوا لوگوں کے درمیان نفرت اور بغض اور انتقام کی جو عالمگیر آگ بھڑکائی گئی اس نے تمام دنیا کے غیر اشتراکی معاشروں کو روس کا مخالف بنا دیا اور اس بنا پر روس مجبور ہو گیا کہ انفرادی ملکیتوں کو ختم کر کے جو تجارتی و صنعتی منافع اس نے بورژوا طبقے کے ہاتھوں میں جانے سے بچایا تھا اس کا ایک بہت بڑا حصہ جنگی تیاریوں پر صرف کر دے۔

ج۔ ان دو بڑی بڑی مدوں میں کھپ جانے کے بعد اس منافع کا جتنا حصہ محنت پیشہ عوام کے نصیب میں آیا ہے وہ بس وہی ہے جو "سوشل انشورنس" کے کام میں صرف ہوتا ہے۔ اور کل منافع کے مقابلہ میں اس کا تناسب کیا ہے؟ انتہائی مبالغہ کے ساتھ بمشکل ایک یا دو فی صدی۔[1]

سوال یہ ہے کہ اگر اتنا ہی کچھ بلکہ اس سے زیادہ اچھی طرح کسی اور طریقہ سے سوشل انشورنس کے لئے ملنے لگے تو پھر اس مار دھاڑ اور اس ظلم و ستم اور اس قربانی دین و اخلاق کے ساتھ انفرادی ملکیتیں ختم کرنے اور خواہ مخواہ اجتماعی ملکیت کا ایک مصنوعی نظام انسانی زندگی پر ٹھونسنے کی آخر حاجت ہی کیا ہے؟

(۲) اجتماعی ملکیت، اجتماعی نظم و نسق اور اجتماعی منصوبہ بندی کو رائج کرنے کے لئے جان و مال اور مذہب و اخلاق اور انسانیت کی جو کثیر بربادی روس کو برداشت کرنی پڑی وہ تو گویا اس تجربہ کے آغاز کی لاگت تھی مگر اب رو بعمل آ جانے کے بعد روز مرہ کی زندگی میں وہ اہل روس کو دے کیا رہا ہے اور ان سے لے کیا رہا ہے اس کا بھی ذرا موازنہ کر دیکھئے۔ وہ جو کچھ انہیں دیتا ہے وہ یہ ہے کہ:-

---

[1] سوشل انشورنس کا فنڈ روس میں جس طریقہ سے فراہم کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر ادارے کا نظم و نسق بحیثیت مجموعی جتنی رقم کارکنوں کے معاوضوں پر صرف کرتا ہے اس کا دس فی صدی سے لے کر ۲۰ فی صدی تک ایک حصہ سے ایک مخصوص قاعدے کے مطابق سوشل انشورنس اسکیم کے حساب میں جمع کر دینا ہوتا ہے۔ اس طرح اوسطاً تمام ملک کی تنخواہوں اور مزدوریوں کے مجموعہ کا ۱۳ فی صدی حصہ کارکنوں کی اجتماعی بہتری پر صرف ہو رہا ہے۔ یہ شکل ہی سے کل معاشی منافع کا ایک یا دو فی صدی حصہ بنتا ہے۔

ہر شخص کے لئے کم از کم اتنے روزگار کا انتظام ہوگیا ہے جس سے وہ دو وقت کی روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا اور سر چھپانے کو جگہ پا سکے۔ اور

اجتماعی طور پر اس امر کا بھی انتظام ہوگیا ہے کہ برے وقت پر آدمی کو سہارا مل سکے۔

بس یہی وہ اصل فائدے ہیں جو اس نئے نظام نے باشندگانِ ملک کو دیئے۔ اب دیکھیے کہ اس نے لیا کیا۔

انفرادی ملکیت کے بجائے اجتماعی ملکیت کا نظام قائم کرنے کے لیے ناگزیر تھا کہ یہ کام وہی پارٹی اپنے ہاتھ میں لے جو اس نظریہ کو لے کر اٹھی تھی یعنی کمیونسٹ پارٹی۔ اس پارٹی کا نظریہ خود بھی یہ تھا، اور خود اس کام کا تقاضا بھی یہی تھا کہ ایک زبردست ڈکٹیٹرشپ قائم ہو جو پورے زور کے ساتھ انفرادی ملکیت کے نظام کو توڑ دے اور سخت ہاتھوں سے نئے نظام کو رائج کر دے۔ چنانچہ یہ ڈکٹیٹرشپ قائم ہوگئی اور اس کو کارکنوں کی ڈکٹیٹرشپ کا نام دیا گیا۔ لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ روس کے مزدوروں اور کاشتکاروں اور مختلف شعبہائے زندگی کے کارکنوں کی ساری آبادی کمیونسٹ پارٹی میں شامل نہیں ہے۔ شاید اس آبادی کے ۵ فی صدی لوگ بھی پارٹی کے ممبر نہ ہوں گے۔ پس ظاہر میں تو نام یہ ہے کہ یہ مزدوروں کی ڈکٹیٹرشپ ہے، مگر حقیقت میں یہ مزدوروں پر کمیونسٹ پارٹی کی ڈکٹیٹرشپ ہے۔ اور یہ ڈکٹیٹرشپ بھی کچھ ہلکی پھلکی سی نہیں ہے۔ اجتماعی ملکیت کے معنی یہ ہیں کہ ملک کے تمام زمیندار ختم کر دیئے گئے اور ایک وحدہٗ لاشریک زمیندار سارے ملک کی زمین کا مالک ہوگیا۔ سارے کارخانہ دار اور تجار اور تاجر بھی ختم ہوگئے، اور ان سب کی جگہ ایک ایسے سرمایہ دار نے لے لی جو ذرائع پیداوار کی ہر قسم اور ہر صورت پر تنہا قابض ہوگیا۔ اور پھر اسی کے ہاتھ میں سارے ملک کی سیاسی طاقت بھی مرکوز ہوگئی۔ یہ ہے کمیونسٹ پارٹی کی ڈکٹیٹرشپ۔ اب اگر روس میں بظاہر آپ یہ دیکھتے ہیں کہ جو لوگ اس پوری معاشی، تمدنی اور سیاسی طاقت کو استعمال کر رہے ہیں وہ عام آبادی کے ووٹوں ہی سے منتخب ہوا کرتے ہیں تو کیا فی الواقع اس کے معنی جمہوریت کے ہیں؟ سارے روس میں کس کی ہمت ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کے مقابلے میں ووٹ مانگنے کے لئے اٹھ سکے؟ اور اگر کوئی اسکی جرأت کرے بھی تو وہ سرزمین روس میں کھائے گا کہاں سے؟ اپنی آواز اٹھائے گا کس پریس سے؟ اور اپنی بات سنانے کے لیے ملک میں سفر کن ذرائع سے کرے گا؟ بلکہ یہ سب کچھ کرنے سے پہلے اسکو زندگی اور موت کا درمیانی فاصلہ طے کرنے میں دیر کتنی لگے گی؟ حقیقت یہ ہے کہ اجتماعی ملکیت کے نظام میں حکومت کے پاس اتنی طاقت جمع ہو جاتی ہے جو

تاریخ انسانی میں کسی چنگیز اور ہلاکو اور نادر اور قیصر کے پاس بھی جمع نہیں ہوئی تھی۔ جو گروہ ایک دفعہ اس طاقت پر قابض ہو جائے پھر اس کے مقابلہ میں باقی ملک والے بے بس ہو جاتے ہیں۔ کسی قسم کی بگڑی ہوئی حکومت کو بدل دینا کبھی اس قدر مشکل نہیں ہے جس قدر ایک بگڑی ہوئی اشتراکی حکومت کو بدلنا مشکل ہے۔

اس نظامِ حکومت میں برسرِاقتدار پارٹی ملک کی مجموعی زندگی کے لئے جو منصوبہ (پلان) بناتی ہے اسے کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے وہ پریس کو، ریڈیو کو، سینما کو، مدرسے کو، پوری انتظامی مشینری کو، اور پورے ملک کے معاشی کاروبار کو ایک خاص نقشے کے مطابق استعمال کرتی ہے۔ اس منصوبے کی کامیابی کا انحصار یہ ہے کہ تمام ملک میں سوچنے اور رائے قائم کرنے اور فیصلہ کرنے والے دماغ صرف وہ چند ہوں جو مرکز میں بیٹھے منصوبہ بنا رہے ہیں۔ باقی سارا ملک صرف عملدرآمد کرنے والے دست و بازو پر مشتمل ہو جو تعمیل ارشاد میں چون وچرا تک نہ کریں۔ تنقید اور نکتہ چینی اور رائے زنی کرنے والوں کے لئے اس نظام میں جیل اور تختہ دار کے سوا کوئی جگہ نہیں ہے۔ اور اگر ایسے دخل در معقولات دینے والے کو ملک بدر کر دیا جائے تو یہ گویا اس کے ساتھ بڑی رعایت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روس میں خود کمیونسٹ پارٹی کے بڑے بڑے سربرآوردہ کارکنوں اور لیڈروں تک کو جن کی محنتوں اور قابلیتوں ہی کی بدولت اشتراکی تجربہ کامیابی کی منزل تک پہنچا، موت اور حبس دوام اور جلاوطنی کی سزائیں دے ڈالی گئیں صرف اس لئے کہ انہوں نے برسرِاقتدار گروہ سے اختلاف کی جرأت کی تھی۔ پھر یہ اشتراکی اخلاقیات کا طرفہ تماشا ہے کہ جس کو بھی اختلاف کے جرم میں پکڑا گیا اس پر طرح طرح کے جھوٹے الزامات بے تحاشا لگا دیئے گئے۔ اور اشتراکی عدالتوں میں بھی یہ ایک حیرت انگیز کرامت پائی جاتی ہے کہ برسرِاقتدار پارٹی جس کو بھی ان کے سامنے ملزموں کے کٹہرے میں لا کھڑا کرتی ہے وہ استغاثے کے عین منشا کے مطابق اپنے جرائم کی فہرست خود ہی فرفر سناتا چلا جاتا ہے اور کچھ دبی زبان سے نہیں بلکہ پورے زور و شور کے ساتھ اعتراف کرتا ہے کہ وہ بہت بڑا غدار اور سرمایہ داروں کا ایجنٹ اور روس کی آستین کا سانپ ہے!

پھر چونکہ یہ نظام انفرادی ملکیتوں اور مذہبی طبقوں کو زبردستی کچل کر قائم کیا گیا ہے اور ابھی وہ سب لوگ دنیا سے اور خود روس کی سرزمین سے مٹ نہیں گئے ہیں جن کے جذبات و حسیات اور حقوق کی قبر پر یہ قصر تعمیر ہوا ہے اس لئے کمیونسٹ پارٹی کی ڈکٹیٹر شپ کو ہر وقت روس میں جوابی انقلاب کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ علاوہ بریں اشتراکی حضرات

یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ ان کے انجذاب کے باوجود انسانی فطرت نام کی ایک چیز موجود ہے اور وہ انفرادی نفع طلبی کا جذبہ رکھتی ہے اور وہ ہر وقت زور لگا رہی ہے کہ پھر انفرادی ملکیت کا نظام واپس آجائے۔ انہی وجوہ سے ایک طرف کمیونسٹ پارٹی خود اپنے نظام کو آئے دن جلاب دیتی رہتی ہے۔ اگر جن لوگوں پر "رجعت" کی ذرا سی بو بھی پائی جائے انہیں "صاف" کیا جاتا ہے۔ اور دوسری طرف پارٹی کی حکومت سارے ملک میں جوابی انقلاب کے خطرات، امکانات، بلکہ شبہات اور وہم و گمان تک کو مٹا دینے کے لیے ہر وقت تلی رہتی ہے۔ اس نے جاسوسی کا ایک وسیع نظام قائم کر رکھا ہے جس کے بے شمار کارکن ہر ادارے، ہر گھر اور ہر مجمع میں "رجعت پسندوں" کو سونگھتے رہتے ہیں۔ اس جاسوسی کے پُراسرار جال نے شوہروں اور بیویوں تک کے درمیان شک و شبہ کی دیوار حائل کر دی ہے۔ حتیٰ کہ ماں باپ کے خلاف خود ان کی اولاد تک سے جاسوسی کی خدمت لینے میں دریغ نہیں کیا گیا ہے۔ روس کی پولیس اور سی آئی ڈی کا محتاط "نظریہ" یہ ہے کہ اگر بھول چوک سے چند سو یا چند ہزار بے گناہ آدمی پکڑے اور مار ڈالے جائیں تو یہ اس سے بہتر ہے کہ چند گنہگار چھوٹ جائیں اور ان کے ہاتھوں سے جوابی انقلاب برپا ہو جائے۔ اسی لیے وہ ہر فیکٹری، ہر کان، ہر دفتر اور ہر ادارے میں دیکھتے رہتے ہیں کہ کونسا مزدور یا کارکن ملک کے یا خود اپنے ادارے کے انتظام پر ناک بھوں چڑھاتا ہے یا کسی قسم کی بے اطمینانی کا اظہار کرتا ہے۔ اسطرح کا کوئی فعل کرنا تو درکنار جس پر شبہ ہو جائے کہ وہ ایسے جراثیم رکھتا ہے وہ بھی اچانک گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ چونکہ یہ آئے دن کا معمول ہے اسلیے جب کوئی کارکن اپنے وقت پر گھر نہیں پہنچتا تو اسکی بیوی خود ہی سمجھ جاتی ہے کہ پکڑا گیا۔ دوسرے دن وہ اسکی ضرورت کی چیزیں آپ ہی آپ پولیس کے دفتر میں پہنچانی شروع کر دیتی ہے اور ان کا قبول کر لیا جانا یہ معنی رکھتا ہے کہ اس کا قیاس صحیح تھا۔ کوئی سوال کرے تو دفتر کی طرف سے اسے کوئی جواب نہیں ملتا۔ ایک روز یکایک ایسا ہوتا ہے کہ اسکا بھیجا ہوا پارسل واپس آجاتا ہے۔ بس یہی اس امر کی اطلاع ہے کہ اسکا شوہر لینن کو پیارا ہوا۔ اب اگر وہ نیک بخت خود بھی اسی انجام سے دوچار ہونا نہ چاہتی ہو تو اس کا فرض ہے کہ ایک اچھی کامریڈنی کیطرح اس معاملے کی بابت ایک حرف منہ سے نہ نکالے اور دوسرا کوئی ایسا خاوند ڈھونڈ لے جو رجعت پسندی کے شبہ سے بالاتر ہو۔

یہ ہے وہ قیمت جو دو وقت کی روٹی اور پیٹ کی دست گیری کیلئے اشتراکی روس کے باشندوں کو ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ کیا واقعی اس قیمت پر یہ سودا سستا ہے؟ بلاشبہ ایک فاقہ کش آدمی بسا اوقات بھوک کی شدت سے اتنا مغلوب ہو جاتا ہے کہ وہ جیل کی زندگی کو اپنی مصیبت بھری آزادی پر ترجیح دینے لگتا ہے، صرف اسلیے کہ وہاں کم از کم دو وقت کی روٹی، تن ڈھانکنے کو کپڑا اور سر چھپانے کو جگہ تو نصیب ہوگی۔ مگر کیا اب پوری نوعِ انسانی کیلئے فی الواقع یہ مسئلہ پیدا ہو گیا ہے کہ اسے روٹی اور آزادی دونوں ایک ساتھ نہیں مل سکتیں؟*

* کیا روٹی ملنے کی اب یہی ایک صورت باقی رہ گئی ہے کہ ساری دنیا ایک جیل خانہ ہو اور چند کامریڈ اس کے جیلر اور وارڈر ہوں؟

سلسلۂ مباحث

"اسلامی ریاست"

بحث اوّل

کارکنوں کی ذمہ داریاں اور ان کے اوصاف

از مولانا امین احسن صاحب اصلاحی

پاکستان بننے سے پہلے بھی، لیکن پاکستان بننے کے بعد خاص طور پر مولانا امین احسن صاحب اصلاحی اسلامی نظام کے مختلف پہلوؤں پر اپنے نتائج تحقیق کو اس طرح مرتب کرکے پیش فرمانا چاہتے تھے کہ دورِ حاضر میں اسلام کے اصولوں پر ایک نظامِ سیاست و تمدن چلانے کے لئے ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کو ضروری رہنمائی مل جائے۔ اس سلسلے میں وہ کام کر رہے تھے مگر ان کا وجود پاکستان کی پبلک کی سیفٹی کے لئے خطرہ بن گیا اور وہ حوالۂ زنداں کر دیئے گئے۔ چنانچہ بات آئی گئی ہوگئی۔ لیکن ہماری خوش قسمتی کہ ابھی چند روز پہلے ان کے کپڑوں کا ایک ٹرنک کھولا گیا تو اس میں مذکورہ بالا تصنیف کے چند مباحث کے مسودے مل گئے۔ ہر چند یہ چند متفرق مباحث ہیں اور پوری تصنیف کی تکمیل مولانا اصلاحی صاحب رہائی کے بعد ہی کر سکیں گے، لیکن ان مسودات کی اشاعت کو اس وقت تک ملتوی رکھنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ سو یہ چند مضامین جنہیں ترجمان القرآن میں بھی اور علیحدہ پمفلٹوں کی صورت میں بھی شائع کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے، مولانا کے سالہا سال کے تحقیق و مطالعہ کا نچوڑ ہیں۔ ان کو پڑھ کر ناظرین کو اندازہ ہوگا کہ فی الواقع اسلام کتنا جامع اور ہر دور کے لئے کتنا تازہ اور ہماری مملکت کے لئے کتنا استحکام بخش ہے:

ان مضامین کی نوعیت وہ نہیں ہے جو علمی "داستان گوئی" کرنے والوں کی تحریروں کی ہوتی ہے، بلکہ یہ اسلام کی انقلابی تحریک کو زندگی و حرکت دینے والے جوہر ہیں۔ یہ واقعاتِ ماضیہ کا ٹھنڈا ٹھنڈا بیان نہیں ہے بلکہ یہ واقعاتِ ماضیہ کو واقعاتِ حال بنانے کے لئے لکھے گئے ہیں۔ اور یہی کوشش جناب مؤلف اور ان کے ساتھیوں کا وہ اصل جرم ہے جس نے انہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا ہے!

(ادارہ)

حکومت کے عہدے اور مناصب حصولِ عزت و جاہ اور کسب دولت کے نہایت کامیاب ذریعے خیال کیے جاتے ہیں اور عام طور پر انکے متعلق لوگوں میں تصور بھی یہ ہے کہ یہ اہل ملک کے حقوق میں شامل ہیں۔ اس وجہ سے نہ صرف ان کے حصول کی جدوجہد جائز سمجھی جاتی ہے بلکہ اس راہ میں مقابلہ و مجادلہ، جوڑ توڑ، سازش و سفارش حتی کہ رشوت و جعلسازی کے سارے فن بھی مباح سمجھ لیے گئے ہیں۔ ہر شخص اپنا حق سمجھ کر انکو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور چونکہ ان سے مال اور عزت دونوں کے حاصل ہونے کی توقع ہوتی ہے اس وجہ سے لوگ جواریوں کی طرح ان کے لئے بازی کھیلتے ہیں اور دین و دنیا کی جو پونجی بھی پاس ہوتی ہے بسا اوقات ساری کی ساری اس داؤں پر لگا دیتے ہیں کہ اگر یہ بازی جیت لی تو ماضی کے سارے نقصانات کی تلافی بھی ہو جائے گی اور مستقبل کی تمام کامیابیوں اور فتوحات کے دروازے بھی کھل جائیں گے۔

مناصب کے متعلق اسلامی تصور لیکن اسلام نے دنیا کے اس رجحانِ عام کے بالکل برعکس، ان عہدوں اور مناصب کو حقوق کی فہرست میں شمار کرنے کے بجائے امانت کی حیثیت دی ہے۔ اس وجہ سے ایک صحیح اسلامی ماحول کے اندر یہ عہدے اور مناصب چاہنے اور طلب کرنے کی چیز نہیں سمجھے جاتے بلکہ بچنے اور بھاگنے کی چیز خیال کیے جاتے ہیں۔ جو لوگ آخرت کی زندگی، قیامت کی باز پرس اور جزا و سزا کے تصور سے بالکل خالی ہوں ان کے لئے تو بلاشبہ ان چیزوں کے اندر بڑی کشش ہو سکتی ہے کیونکہ ان کے سامنے ان کے صرف روشن پہلو ہی ہوتے ہیں، ان کے تاریک پہلوؤں سے وہ بالکل ناواقف ہوتے ہیں۔ زندگی کی دوسری نعمتوں سے جس طرح بغیر کسی احساسِ ذمہ داری کے وہ متمتع ہوتے ہیں اور اپنے اس عیش کو فکرِ فردا کے اندیشوں سے مکدر نہیں ہونے دیتے اسی طرح ملی اور قومی ذمہ داریوں کو بھی وہ کبھی ذمہ داری کی حیثیت سے نہیں اٹھاتے بلکہ ایک حق سمجھ کر لیتے ہیں اور جب تک ان کا بس چلتا ہے اسی حیثیت سے ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ لیکن ایک مسلمان جس کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ تم میں سے ہر ایک چرواہا ہے اور ہر ایک سے اس کے گلہ کی بابت پرسش ہوگی ــــ مرد سے اس کی بیوی بچوں کے بابت سوال ہوگا، عورت سے اس کے شوہر اور مال اولاد کے متعلق سوال ہوگا ــــ آقا سے اس کے غلام کے متعلق سوال ہوگا، حکمران سے اسکی رعایا کے متعلق سوال ہوگا ــــ وہ اس حقیقت کو سمجھتے ہوئے کس طرح اس بات کی آرزو کر سکتا ہے کہ ان بہت سارے بوجھوں کے ساتھ جو پہلے سے اس پر لدے ہوئے ہیں، کسی شہر کا قاضی، کسی صوبہ کا والی یا کسی ملک کا امیر بنا کر اس شہر یا صوبہ یا ملک کا بوجھ بھی اسکی کمر پر لادو؟

جائے۔ یہ حماقت تو وہی شخص کر سکتا ہے جو اس زندگی کی ذمہ داریوں سے بالکل ناآشنا ہو، ورنہ جو آپ کو بالکل فانی اور پار پا ہو۔ ایک راستباز مسلمان جو اپنے فرائض سے اچھی طرح واقف ہے، ان پر ان ذمہ داریوں کا اپنے دل میں خیال بھی نہیں لا سکتا چہ جائیکہ وہ ان کے لئے خم ٹھونک کر میدانِ مقابلہ میں آئے۔ جو ذمہ داریاں خود اس پر پیش کی جائیں اور مفارشیں بہم پہنچائے تو وہ خود تو حتی الامکان ان سے دور ہی رہنے کی کوشش کریگا لیکن اس کے باوجود اگر کوئی امانت اس کے سپرد ہی کر دی جائے گی تو منشاء اللہ تعالیٰ کی آزمائش سمجھ کر اٹھائیگا اور پھر اس بات کیلئے مستعد رہیگا کہ قیامت کے دن یہ امانت اس کے لئے ندامت و رسوائی کا سبب نہ بنے۔ اسی حقیقت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو سمجھایا تھا جب انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حکومت کے کسی عہدے کے لئے درخواست کی تھی۔

> حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ مجھ کو کسی عہدہ پر مقرر کیا جائے۔ آنحضرت نے ان کو جواب دیا: ابوذر یہ عہدہ تو ایک امانت ہے اور تم ایک کمزور آدمی ہو، قیامت کے دن یہ امانت رسوائی و ندامت کا سبب ہوگی الا اس شخص کے لئے جو اس کے حق کے ساتھ اسکو اٹھائے اور اس کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں عائد ہوں ان کو ادا کرے۔ (مخرجہ تاج بروایت صحیح مسلم)

خدا کی امانت | صرف اتنا ہی نہیں کہ اسلام نے ان عہدوں اور مناصب کو امانت قرار دیا ہے بلکہ ان کو خدا کی امانت قرار دیا ہے۔ تمام دنیوی حکومتوں میں اول تو امانت کا تصور، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، سرے سے موجود ہی نہیں ہے اور اگر کہیں کوئی دھندلا سا تصور ہے بھی تو وہ قومی امانت کا ہے۔ اس وجہ سے جہاں قومی حمیت پُرزور ہوتی ہے یا قوم کے احتساب کا ذریعہ قوی ہوتا ہے وہاں تو امانت داری کی ذمہ برداری ایک حد تک برت لی جاتی ہے لیکن جہاں یہ چیز قومی یا احتساب کا خطرہ موجود نہ ہو وہاں ہر طرح کی خیانت کے لئے ہاتھ پاؤں بھی آزاد ہو جاتے ہیں اور ضمیر بھی بالکل بے حس ہو جاتا ہے۔ لیکن اسلام نے ان کو خدا کی امانت قرار دے کر ان کی نگرانی کے لئے دہرے پہرے بٹھا دیئے ہیں۔ قوم کی نگاہیں چوک سکتی ہیں لیکن خدا کی نگاہ سے کوئی مخفی سے مخفی خیانت بھی پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ وہ خیانتوں اور بدخواہیوں کو دیکھتا ہی ہے اور امانت داریوں میں جس حد تک خلوص یا ریا ہے اس کو اچھی طرح پرکھتا بھی ہے اور اسی خلوص اور ریا کے لحاظ سے ہر چیز کی قیمت ٹھہرائے گا اور ہر ایک کو اس کے کئے کا پورا پورا بدلہ دے گا۔ اس

دوسرے احتساب کے خوف کا یہ اثر ہے کہ جن عہدوں اور مناصب کے لئے جاہلی نظاموں میں بڑے بڑے مقابلے ہوتے ہیں اور ہر شخص ان کو جیتنے کے عشق میں سب کچھ ہارنے کے ارادے سے میدان میں اترتا ہے، ایک صحیح اسلامی ماحول کے اندر اس "متاعِ کمر مخر" کے قبول کرنے والے بڑی مشکلوں سے ڈھونڈنے پڑتے ہیں جن اسامیوں کے لئے پبلی، اے الیس، اور پی سی الیس کی قسم کے کثیر المصارف امتحانات مقابلہ رکھے گئے ہیں لیکن اس کے باوجود لوگوں کے شوق وطلب کا یہ عالم ہوتا ہے کہ بالآخر امیدواروں کے حق کا فیصلہ قابلیت کی کسوٹی کے بجائے رشوت اور سفارش ہی کے معیارات سے کرنا پڑتا ہے، ان اسامیوں کے لئے اس ماحول میں جہاں اسلامی ذہنیت نشوونما پا چکی ہو، اہل اشخاص کی منتیں کی جاتی ہیں تب کہیں جا کر لوگ یہ کانٹوں کے تاج پہننے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ ذیل میں ہم چند حدیثیں درج کرتے ہیں جن سے اندازہ ہو سکیگا کہ دنیا کے بازاروں کی اس سب سے زیادہ محبوب و مطلوب اور گراں جنس کی قدر و قیمت کا اسلامی بازار میں کیا حال ہے:-

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لئے جج بنایا گیا وہ بغیر چھری کے ذبح کر دیا گیا۔" (رواہ الخمسۃ الا النسائی)

"ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص لوگوں کے درمیان فیصلہ کرتا ہے وہ قیامت کے روز روکا جائے گا۔ ایک فرشتہ اس کی پشت سر کو پکڑے ہوئے اسکو جہنم کے کنارے پر روکے گا۔ پھر اس کے سر کو اللہ کی طرف اٹھائے گا۔ اگر وہ حکم دے گا کہ اسکو پھینک دے تو وہ اسکو ایک کھڈ میں پھینک دے گا اور وہ چالیس سال کی مسافت کی گہرائی میں گر جائے گا۔" (رواہ احمد و ابن ماجہ بمعناہ)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حاکموں کے لئے ہلاکی ہے، چودھریوں (سرفا) کے لئے ہلاکی ہے، امتولیوں (امنا) کے لئے ہلاکی ہے۔ قیامت کے دن بہت سے لوگ ہوں گے جو تمنائیں کریں گے کہ کاش ان کی چوٹیاں ثریا سے بندھی ہوتیں اور وہ آسمان و زمین کے درمیان لٹکے ہوئے ہوتے اگر کسی ذمہ داری کے عہدے پر نہ مقرر کئے گئے ہوتے۔"

ابو دارؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص دس یا اس سے زیادہ آدمیوں کے معاملات کا ذمہ دار ہے وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے حضور اس طرح آئیگا کہ اس کے ہاتھ اسکی گردن

کے ساتھ بندھے ہوئے ہونگے۔ پھر یا تو اسکی نیکی اس کو آزادی دلائے گی یا اُسکے گناہ اسکو ہلاک کریں گے اِس (امارت) کا آغاز ملامت، اس کا وسط ندامت اور اس کا آخر قیامت کے دن رسوائی ہے"۔

"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے۔ ایک زمانہ آئیگا کہ تم لوگ امارت (سرداری) کی حرص کروگے حالانکہ یہ قیامت کے دن ندامت کا سبب ہوگی۔ یہ کیا ہی اچھی دودھ پلانے والی اور کیا ہی بُری دودھ چھڑانے والی ہے"۔[1]

(احمد، بخاری، نسائی)

اس میں شبہ نہیں کہ یہ سارے ڈراوے اُن لوگوں کیلئے ہیں جو کسی عہدہ کی ذمہ داریاں اسکو اٹھانے کے بعد ادا نہ کریں۔ رہے وہ لوگ جو ان کی ذمہ داریاں ٹھیک ٹھیک ادا کردیں تو اُن کے اجر وثواب کی بھی کوئی حد نہیں ہے۔ عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ

"انصاف کرنے والے (امراء اور حکام) نور کے منبروں پر اللہ تعالیٰ کے داہنے بیٹھے ہونگے اور جو لوگ اپنے فیصلہ میں، اپنے اہل وعیال میں، اور اپنے دائرہ اقتدار میں انصاف کرتے ہیں اُن کی آستینوں میں خدا کے ہاتھ میں"۔ (رواہ احمد ومسلم)

لیکن اسکے باوجود ان پہلی وعیدوں سے جو شخص واقف ہوگا وہ اپنے آپکو خود کس طرح اس بات کیلئے پیش کریگا کہ اسکو بغیر چھری کے ذبح کردیا جائے؟

عہدوں کے طالب خائن ہیں اس تصور کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ عہدوں اور مناصب کے لئے بھاگ دوڑ کرتے ہیں، اسلامی ماحول کے اندر وہ متہم اور خائن خیال کئے جاتے ہیں اور بسا اوقات ان کا یہ فعل ہی انکو اس عہدے کے لئے نااہل قرار دینے کے واسطے کافی سمجھا جاتا ہے۔ اتنی بڑی آزمائش میں پڑنے کے لئے جو شخص اپنے آپ کو خود پیش کرتا ہے وہ دو حالتوں سے خالی نہیں۔ یا تو وہ اپنی ذمہ داری اور اس کے دور رس نتائج سے بالکل ناواقف ہے۔ یا اسکی نیت میں فتور ہے اور وہ اپنی خواہش سے بے بس ہوگیا ہے۔ اگر پہلی صورت ہے تو ایسا شخص امتحان میں پڑنے کے بعد ممکن ہے کہ اپنے آپ کو ترغیبات کے فتنوں سے بچا سکے۔ جب کوئی آزمائش سامنے آجائے گی اس کے قدم ضرور لڑکھڑا جائیں گے۔ اور اگر دوسری شکل ہے تو ایسا شخص پہلے مرحلہ ہی پر خائن اور بددیانت ہے۔ اسکو کوئی ذمہ داری سونپنا گویا چور کو کوتوال بنانا ہے۔ اس وجہ اسلام میں عہدہ کی طلب کو ایک مستقل دلیل نااہلیت قرار دے دیا گیا ہے۔

---

[1] یعنی اس کا آغاز نہایت دلکش اور لذیذ لیکن اس کا انجام اپنی ذمہ داریوں کے لحاظ سے نہایت ہولناک ہے۔

"حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ دو آدمی میرے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ایک نے کہا کہ ہم اس لئے حاضر ہوئے ہیں کہ آپ ہمیں حکومت کے کسی منصب پر مقرر فرمائیں۔ دوسرے نے بھی اسی قسم کی خواہش ظاہر کی۔ آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا: ان اخونکم عندنا من طلبه (ہمارے نزدیک تم میں سب سے بڑا خائن وہ ہے جو کوئی عہدہ طلب کرے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری فرماتے ہیں کہ فلم یستعن بهما فی شیء حتی مات۔ آنحضرتؐ نے ان میں سے کسی کو کوئی کام نہیں سپرد فرمایا یہاں تک کہ آپ نے وفات فرمائی۔"

(ابوداؤد، کتاب الخراج والفئی والامارۃ)

طلب کرکے عہدہ پانے والے خدا کی مدد سے محروم ہیں

عہدوں کے امانت اور آزمائش ہونے کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی تو مدد فرماتا ہے جو خود تو ان سے بھاگنے والے ہوتے ہیں اور اس کے باوجود کسی عہدہ کی ذمہ داری ان پر آپڑتی ہے لیکن ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے جو خود اپنے آپ کو کسی عہدہ کے لئے پیش کرتے ہیں اور اس سے ڈرنے اور بھاگنے کے بجائے دوڑ دوڑ کر اسکو اپنے گھر بلاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا عام قانون یہ ہے کہ جو آزمائش خود اپنی طرف سے بندوں پر آپڑتی ہے اس میں ان کی مدد فرماتا ہے اور اگر وہ اس سے ٹھیک ٹھیک عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کی اس کوشش میں کامیابی بھی عطا فرماتا ہے۔ لیکن اگر کسی آزمائش میں ڈالے جانے کے لئے کوئی شخص اپنے آپ کو خود پیش کرتا ہے تو وہ اسکو اس کے حال پر چھوڑ دیتا ہے اور مدد فرمانے کے بجائے بالکل غیر جانبدار ہوکر دیکھتا ہے کہ جس ذمہ داری کو اس نے اتنے شوق سے اٹھایا ہے اسکو کس حد تک سنبھالتا ہے اور کیا بناتا ہے۔

"عبدالرحمٰن بن سمرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عبدالرحمٰن بن سمرہ امارت کے طالب نہ بنو۔ اگر یہ بن مانگے تمہیں ملی تو اس کام میں خدا کی طرف سے تمہاری مدد کی جائے گی اور اگر اس کو مانگ کر لو گے تو تم اسکے حوالے کر دیئے جاؤ گے۔" (متفق علیہ)

"حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص خود اس بات کا طالب ہوتا ہے کہ اسکو قاضی بنایا جائے اسکو اس کے نفس کے حوالے کر دیا جاتا ہے اور جو شخص اس عہدہ کو قبول کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے اس پر ایک فرشتہ اترتا ہے جو اسکی رہنمائی کرتا رہتا ہے۔" (رواہ الخمسۃ الا النسائی)

ذمہ داری کا احساس

یہی وجہ ہے کہ خدا کے صالح بندے ہمیشہ عہدوں اور ذمہ داریوں سے بھاگتے رہے ہیں اور اگر ان پر اس قسم کا کوئی بوجھ ان کی خواہش کے خلاف ڈال دیا گیا ہے تو ان کی ساری زندگی اس بوجھ کے نیچے دب کے رہ گئی ہے۔ ان کے لئے نہ کھانے پینے میں کوئی لذت باقی رہ گئی، نہ سونے میں کوئی راحت۔ نہ بیوی بچوں کے اندر ان کے لئے کوئی خوشی رہ گئی، نہ دوست و احباب کے اندر کوئی دلچسپی۔ ایک معزز عہدے کے ملنے پر خوشیاں مناتا اور جشن کرنا تو الگ رہا، زندگی کی جو تھوڑی بہت آزادیاں انہیں میسر تھیں وہ بھی ان سے چھین گئیں۔ اس منصب کے ذریعہ سے بیوی بچوں کے گرد فراوانی اعزہ و اقربا کے شان و اعزاز میں چار چاند لگانا تو درکنار، اب تک اپنی انفرادی سعی سے جو خدمت اُن کی بن آتی تھی اس منصب کی ذمہ داریوں نے اس سے بھی ان کو محروم کر چھوڑا۔ زندگی کا ایک ایک لمحہ اللہ کے دین اور ملّت کی خدمت کے لئے وقف ہو گیا۔ ان کے عزیز و قریب سب جیتے جی ان سے بیگانہ ہو کے رہ گئے۔ سب سو رہے ہیں، وہ جاگ رہے ہیں۔ سب بے فکر ہیں وہ سب کے لئے فکر مند اور غمگین ہیں۔ سب اپنی اور اپنے بال بچوں کی خوشیوں کے اسباب فراہم کرنے میں منہمک ہیں اور وہ ساری خدائی کا بوجھ اپنے سر پر اٹھائے ہوئے نہ رات کے سکون سے آشنا ہیں نہ دن کی دلچسپیوں سے۔ یہاں ہم ان لوگوں کے احساسات کا ایک ہلکا سا عکس پیش کرنے کی کوشش کریں گے جو ان ذمہ داریوں کی صحیح اہمیت سے واقف تھے اور قوم کی طرف سے جو خدمت ان کے سپرد کی گئی تھی اسکو مومنانہ دیانت کے ساتھ ادا کرنا چاہتے تھے۔ اس سے اندازہ ہو سکیگا کہ جن بستروں پر لیٹ کر دنیا نے عیش کے مزے لوٹے ہیں انہی بستروں پر خدا کے احساس رکھنے والے بندوں نے کیسی بے چین راتیں گذاری ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب حضرت عمر رضؓ کو خلافت کے لئے نامزد فرمایا تو ان کو بلا کر مندرجہ ذیل نصیحت فرمائی :-

> "میں تم کو ایک نصیحت کرتا ہوں، اگر تم اسکو یاد رکھو گے تو موت سے زیادہ کوئی چیز تم کو محبوب نہ ہوگی اور وہ لازماً آنی ہے اور اگر تم اسکو بھلا دو گے تو موت سے زیادہ کوئی چیز تمہارے نزدیک مبغوض نہ ہوگی حالانکہ تم اس سے کسی طرح بچ نہیں سکتے۔ تم پر اللہ تعالےٰ کے حقوق رات میں ہیں جنکو وہ دن میں قبول نہیں کریگا، اور کچھ حقوق دن میں ہیں جنکو وہ رات میں نہیں قبول فرمائے گا۔ اور وہ نفل نہیں قبول کرے گا جب تک تم فرائض نہ ادا کر لوگے۔

ہلکی میزان دراصل ان لوگوں کی ہے جن کی میزان قیامت کے روز اس وجہ سے ہلکی ہو کہ انہوں نے دنیا میں باطل کی پیروی کی جو ہلکا اور بے وزن ہے اور جس میزان میں باطل رکھا گیا ہے اس کے لئے یہی زیبا ہے کہ وہ ہلکی ہو۔ اور بھاری میزان دراصل ان لوگوں کی میزان ہے جو قیامت کے دن اس وجہ سے بھاری ہو کہ انہوں نے دنیا میں حق کی پیروی کی جو بھاری ہے اور جس میزان میں صرف حق رکھا گیا ہے اس کے لئے یہی زیبا ہے کہ وہ بھاری رہے۔ اگر تم نے میری یہ نصیحت یاد رکھی تو موت سے زیادہ کوئی غائب تم کو محبوب نہ ہوگا اور وہ بہر حال آئے رہیگی اور اگر تم نے یہ نصیحت بھلا دی تو کوئی غایب تم کو موت سے زیادہ مبغوض نہ ہوگا اور تم اس سے بھاگ نہ سکوگے"۔

اسماء بنت عمیس (حضرت ابوبکر کی بیوی) سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ سے یہ بھی فرمایا:۔

"میں اپنے پیچھے جو عظیم الشان ذمہ داری چھوڑ کے جا رہا ہوں اسکو سامنے رکھکر میں نے تم کو خلیفہ بنایا ہے۔ تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی ہے اور دیکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح اپنی ذات پر ہم کو اور اپنے بیوی بچوں کو ترجیح دیتے تھے یہاں تک کہ حضورؐ کے بخشے ہوئے عطیوں کے بچے ہوئے حصہ میں سے ہم حضور ہی کے بیوی بچوں کو ہدیے بھیجتے تھے۔ اور تم نے میری بھی صحبت اٹھائی ہے، اور یہ دیکھا ہے کہ میں نے اپنے پیشرو کی کس طرح پیروی کی ہے۔ واللہ ما نمت فحلمت، وما توہمت فسھوت وانی لعلی السبیل ما زغت۔ (خدا کی قسم میں کبھی غافل ہو کے نہیں سویا کہ مجھے خواب نظر آتے اور نہ میں نے ہوا میں قلعے بنائے کہیں بھٹکتا، میں سیدھے راستہ پر قائم رہا اس سے کج نہیں ہوا) اور سب سے پہلی چیز جس سے اے عمرؓ میں تم کو ڈراتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہر نفس کی ایک خاص طرح کی خواہش ہوتی ہے۔ اگر اسکی وہ خواہش پوری کر دی جاتی ہے تو پھر وہ دوسری کے لئے پاؤں پھیلاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے اُن لوگوں سے ہوشیار رہنا جن کے پیٹ طرح طرح کے ارمانوں سے پھولے ہوئے ہیں اور جن کے دماغ اونچی اونچی فضاؤں میں پرواز کر رہے ہیں اور جن میں سے ہر شخص اپنی ذات کی بلندی کا خواہاں ہے۔ انہی میں سے ایک کی لغزش کی وجہ سے ان کو ایک سخت حیرانی اور سرگشتگی پیش آنوالی[1] ہے۔ پس خبردار تم وہ شخص نہ بننا۔ اور اس بات کو خوب یاد رکھو کہ جب تک تم اللہ سے ڈرتے رہوگے یہ لوگ

[1] یہ اس فتنہ کی طرف اشارہ ہے جو حضرت عثمان غنی رض کے زمانہ میں پیش آیا۔

تم سے ڈرتے رہیں گے اور جب تک تم سیدھے راستہ پر ہو گے یہ لوگ تمہارے لئے سیدھے رہیں گے۔"

(۶-۷، کتاب الخراج قاضی ابو یوسف)

حضرت عمرؓ نے اس بار کو جیسا کچھ محسوس کیا اس کا ایک سرسری اندازہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے ایک بیان سے ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:-

جب حضرت عمرؓ کو خنجر مارا گیا میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ امیر المومنین جنت کی بشارت قبول کیجئے جس وقت لوگوں نے کفر کیا آپ نے اسلام قبول کیا جس وقت لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑا آپ نے ان کے ساتھ ہو کر جہاد کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت دنیا سے رخصت ہوئے آپ سے راضی تھے۔ آپ کی خلافت کے بارہ میں دو آدمیوں نے بھی اختلاف نہیں کیا اور اب آپ کی موت شہادت کی موت ہو رہی ہے۔ حضرت عمرؓ نے سب کچھ سننے کے بعد فرمایا: جو کچھ کہا ہے ذرا اسکو پھر دہرانا۔ میں نے تعمیل ارشاد کی۔ انہوں نے میری پوری بات سننے کے بعد فرمایا، اس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ زمین پر جتنا سیم و زر بھی ہے اگر وہ سارا کا سارا مجھے مل جائے تو میں ظاہر ہونے والے دن کے ہول سے بچنے کے لئے فدیہ میں دے دونگا۔"

(۷-۸ - کتاب الخراج ایضاً)

حضرت عمرؓ کی زندگی کا ہر واقعہ اس بات کی شہادت ہے کہ انہوں نے خلافت کی ذمہ داریوں کو ویسا ہی کچھ محسوس کیا جیسا ان کو محسوس کرنیکا حق تھا۔ بہت سارے واقعات نقل کرنے میں طوالت ہوگی۔ ہم صرف اس زمانہ کے بعض واقعات نقل کرنے پر اکتفا کریں گے جس زمانہ میں عام الرمادہ کا مشہور قحط واقع ہوا۔ اس قحط نے اس حقیقت کو پوری طرح آشکارا کر دیا کہ ایک اسلامی حکومت کے امیر کی ذمہ داری فی الواقع کیا ہے اور حضرت عمرؓ نے اسکو کسی طرح محسوس کیا۔ یہ واقعات میں مصر کے مشہور عالم محمد حسین ہیکل کی کتاب "الفاروق عمر" سے یہ اطمینان کر لینے کے بعد نقل کر رہا ہوں کہ انہوں نے یہ قابل اعتماد کتابوں سے لئے ہیں۔

"عام الرمادہ میں لوگوں نے دیکھا کہ حضرت عمرؓ کا سرخ و سفید رنگ بالکل سیاہ پڑ گیا ہے۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ زمانہ قحط میں رعایا کی تکلیف میں شریک ہونے کے خیال سے انہوں نے اپنے اوپر گھی اور دودھ وغیرہ کی قسم کی چیزیں بالکل حرام کر لی تھیں۔ زیادہ تر بھوکے رہتے۔ یہاں تک کہ لوگ ان کی حالت دیکھ کر

ہے کہنے لگے کہ اگر قحط دور نہ ہوا تو حضرت عمرؓ کو رعایا کا غم ہلاک کر ڈالے گا"۔

"قحط کے زمانہ میں حضرت عمرؓ نے گھر میں کھانا کھانا ترک کر دیا۔ باہر بھوکوں کو کھلانے کے لئے جو کچھ پکاتے وہی کھانا عام لوگوں کے ساتھ خود بھی کھا لیتے۔"

قحط کی شدت جب بہت بڑھ چکی تھی، ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے سامنے گھی میں چوری کی ہوئی روٹی لائی گئی۔ انہوں نے ایک بدو کو اپنے ساتھ کھانے میں شریک کر لیا۔ بدو تھالی کے اندر گھی کے ذرے ایک ایک کونے سے تلاش کرتا۔ حضرت عمرؓ نے اس کا یہ حال دیکھ کر فرمایا "شاید تمہیں گھی بہت مدت سے کھانے کو نہیں ملا ہے؟" اس نے کہا، ہاں اے امیر المومنین، اتنی مدت سے (اس نے کچھ مدت متعین کر کے بتائی) نہ گھی کھایا نہ کوئی اور روغن اور نہ کسی کھانے والے ہی کو دیکھا۔ حضرت عمرؓ نے یہ سنا تو اس قدر متاثر ہوئے کہ قسم کھا لی کہ جب تک قحط دور نہ ہوگا، نہ گوشت کھاؤں گا اور نہ گھی اور اس عہد پر اس وقت تک قائم رہے جب تک قحط دور نہ ہو گیا۔"

"اس عہد پر اس مضبوطی کے ساتھ قائم رہے کہ ایک روز بازار میں دودھ اور گھی بکنے آیا۔ ان کے غلام نے چالیس درہم میں اسکو خرید لیا۔ لیکن جب ان کو جا کر اس واقعہ کی اطلاع دی تو انہوں نے ارشاد فرمایا کہ تم نے بہت گراں خریدا۔ جاؤ اسکو صدقہ کر دو۔ میں اتنا اسراف کر کے کوئی چیز نہیں کھاؤں گا۔ اس کے بعد کچھ دیر سر جھکائے کھڑے رہے اور پھر بولے، کیف یعنینی شان الرعیۃ اذا لم یمسسنی ما یمسھم (مجھے رعایا کے دکھ کا کیا اندازہ ہوگا اگر مجھ پر وہی کچھ نہ گذرے جو ان پہ گذر رہی ہے)"۔

اس زمانہ میں جو سختیاں حضرت عمرؓ نے اپنی جان پر برداشت کیں اور جو سختیاں اپنے بیوی بچوں پر ڈالیں ان کے بہت سے واقعات ابن سعد نے "طبقات" میں روایت کئے ہیں۔ ان میں سے بعض یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

ایک مرتبہ ان کے سامنے گھی میں پکا ہوا گوشت لایا گیا۔ اس کے کھانے سے یہ کہہ کر انہوں نے انکار کر دیا کہ ان دونوں میں سے ہر ایک بجائے خود سالن ہے۔ پھر اس اسراف کی کیا ضرورت تھی؟"

"ایک شخص سے پینے کے لئے پانی مانگا۔ اتفاقاً اس کے پاس شہد موجود تھا اس نے وہ پیش کر دیا۔ آپ نے اسکو واپس کر دیا کہ میں اسکو قیامت کے روز حساب میں شامل نہیں کرانا چاہتا۔"

"اپنے بچوں میں سے کسی کے ہاتھ میں خربوزے کی ایک پھانک دیکھ لی۔ اس کے پیچھے بھاگے کہ امیرالمومنین کے فرزند تم خربوزے اڑا رہے ہو اور امتِ محمدؐ تباہ ہو رہی ہے! بچہ روتا ہوا گھر میں بھاگا۔ جب ان کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ یہ خربوزہ ایک کف دست کھجور کی گٹھلیاں دے کر خریدا گیا ہے تب کہیں جا کر مطمئن ہوئے۔"

"ایک عورت کو دیکھا کہ راستہ میں بیٹھی آٹا گوندھ رہی ہے اسکو بلا کر کچھ بنا رہی ہے لیکن اس سے بن نہیں رہا ہے فرمایا اس طرح نہیں اس طرح بناؤ اور یہ کہہ کر اس کے پاس بیٹھ کر خود بنانے لگے۔"

"حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ انہوں نے حضرت عمرؓ کو دیکھا کہ گھی کا برتن اور آٹے کی بوری لئے ہوئے ہیں۔ رستے میں کچھ بھوکے لوگ نظر آئے تو ان کو خود پکا کر کھلایا۔"

"قحط کی شدت کے زمانے میں یہ معمول رہا کہ لوگوں کو عشاء کی نماز پڑھا کر گھر میں داخل ہوتے اور آخر شب تک گریہ وزاری میں مشغول رہتے اور دعا کرتے کہ اے اللہ اس امت کی تباہی میرے ہاتھوں نہ ہو۔ لیکن جب یہ دعا قبول نہ ہوئی اور آسمان سے پانی کی ایک بوند بھی نہ ٹپکی تو اپنے عمال کو لکھا کہ ایک معین دن میں لوگوں کو لے کر نکلو اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ اس قحط کو دور فرمائے۔ خود بھی لوگوں کو لے کر نکلے۔ سر پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر مبارک تھی۔ نماز کی جگہ پہنچ کر سب نے خوب رو رو کر دعائیں کیں۔ حضرت عمرؓ خود اس قدر روئے کہ ان کی داڑھی تر ہو گئی عباس بن عبدالمطلب پہلو میں کھڑے تھے حضرت عمرؓ نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور سر آسمان کی طرف اٹھا کر کہا اے اللہ۔ ہم تیرے رسول کے چچا کو تیرے حضور سفارشی بناتے ہیں حضرت عباسؓ نے بھی خوب رو رو کے دعا کی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی۔"

جس شخص نے اپنی ذمہ داریوں کو اس گرمی اور بے نفسی کے ساتھ ادا کیا کہ اسکی کوئی اور مثال اس کے پیشرو کے سوا تاریخ میں نہیں ملتی وہ یہ سب کچھ کرنے کے باوجود ایک لمحہ کے لئے بھی مطمئن نہیں ہوا کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ وہ اکثر یہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی اور آپ دنیا سے جب تشریف لے گئے

تو مجھ سے راضی تھے میں نے ابوبکرؓ کی صحبت اٹھائی اور وہ بھی مجھ سے سلامت گئے۔ مجھے کسی بات کی بھی پریشانی نہیں ہے۔ بس مجھے اگر کوئی پریشانی ہے تو اس امارت کی ذمہ داریوں کی پریشانی ہے۔ "ان کے لئے اس قدر پریشان رہتے کہ نہ شب میں آرام فرماتے نہ دن میں۔ جب بعض لوگوں نے توجہ دلائی کہ آپ کی صحت خراب ہو جائے گی تو فرمایا "کیا کروں اگر شب میں آرام کروں تو میں تباہ ہو جاؤں گا اور دن میں آرام کروں تو رعایا تباہ ہو جائیگی" اور ان تمام جاں بازیوں کا دنیا میں تو کوئی صلہ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا انہوں نے قبول نہیں فرمایا لیکن آخرت میں بھی کسی رعایت کے متوقع نہ تھے۔ بار بار یہی فرماتے تھے کہ برابر سرابر پر چھوٹ جاؤں تو بہت ہے۔ آخری حج کے موقع پر منیٰ میں ایک جگہ چادر زمین پر بچھا دی اور اس پر لیٹ گئے اور ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر نہایت رقت کے ساتھ یہ دعا فرمائی:۔

اللّٰھم کبرت سنی و رقّ عظمی و ضعفت	اے خدا میں بوڑھا ہو گیا میری ہڈیاں پتلی ہوگئیں
قوتی وانتشرت رعیتی فاقبضنی الیک غیر	میری قوت کمزور ہوگئی، میری رعایا بہت پھیل گئی ہے
مضیع ولا ملوم -	اب تو مجھے اپنے پاس اس حال میں بلا لے کہ نہ میں
	قاصر رہوں اور نہ سزاوار ملامت۔

اس ذمہ داری کے احساس کا یہ عالم تھا کہ وفات کے وقت حضرت عبداللہ بن عمرؓ آپ کا سر اپنی ران پر لئے ہوئے بیٹھے تھے۔ جب حضرت عمرؓ نے محسوس فرمایا کہ اب آخری وقت آن پہنچا ہے تو بیٹے سے فرمایا کہ میرا منہ زمین پر رکھ دو۔ عبداللہ بن عمرؓ نے کہا میری ران اور زمین دونوں یکساں ہیں۔ تیز ہو کر بولے نہیں میرا منہ زمین پر رکھ دو۔ جب انہوں نے منہ زمین پر رکھ دیا تو پاؤں برابر کر لئے اور فرمایا میری اور میری ماں کی تباہی ہے اگر اللہ نے میری مغفرت نہ فرمائی؛ وہ یہی کہتے ہوئے جان اپنے پروردگار کے سپرد فرمائی۔

خلفائے بنی امیہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اسلام اور اسلامی نظام کی روح سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان پر جب امارت کا بار گراں ڈالا گیا تو اس کی ذمہ داریوں کے احساس نے ان کا جو حال کیا اور ان کی خلافت سے پہلے اور خلافت کے بعد کی زندگی میں جو عظیم الشان فرق واقع ہوا اس کا ایک سرسری اندازہ ذیل کے بیانات سے ہو سکیگا۔

"مدینہ کے ایک شیخ روایت کرتے ہیں کہ میں نے عمر بن عبدالعزیز کو مدینہ میں دیکھا تھا وہ سب سے زیادہ خوش پوشاک، سب سے زیادہ خوشبو لگانے والے اور سب سے زیادہ اکڑ کر چلنے والے تھے۔ پھر میں نے ان کو خلیفہ ہونے کے بعد

دیکھا کہ ان کا چلنا بالکل اِدھیڑ کے چلنے کی طرح ہوگیا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ دعوےٰ کرے کہ انداز رفتار ایک فطری چیز ہے، اس میں تغیر ممکن نہیں ہے، تو حضرت عمر بن عبد العزیز کا تغیر حال اس دعوے کی کھلی ہوئی تردید ہے ۔"
(کتاب الخراج قاضی ابو یوسف صفحہ)

محمد بن کعب قرظی سے روایت ہے کہ :-

"جب حضرت عمر بن عبد العزیز خلیفہ ہوئے تو انہوں نے مجھے بلایا۔ میں مدینہ میں تھا۔ حاضر خدمت ہوا تو ان کو دیکھ کر مجھے اس قدر حیرانی ہوئی کہ فرط حیرت سے میری نظر ان کے چہرہ پر گڑ گئی۔ میری اس حیرت کو محسوس کر کے بولے: ابن کعب کیا بات ہے تم پہلے کبھی مجھ کو اس طرح نہیں دیکھا کرتے تھے؟ میں نے عرض کیا آپ کی حالت پہ تعجب کر رہا ہوں۔ پوچھا میری کس حالت پر؟ میں نے عرض کیا آپ کے چہرہ کی بے رونقی پر، آپ کے جسم کی کمزوری پر، آپ کے بالوں کے جھڑ جانے پر! فرمایا تمہارا اس وقت کیا حال ہوگا جب تم چند دنوں کے بعد مجھ کو گڑھے میں قبر میں لٹا دیا گیا، میرے چہرے پر گالوں پر بہ گئے اور میرے نتھنوں سے خون اور پیپ جاری ہے؟ اس وقت تو تمہاری حیرانی کی کوئی حد نہیں رہے گی!" (کتاب الخراج صفحہ)

"حضرت عمر بن عبد العزیز جب خلیفہ ہوئے تو وہ جیسے تو اس عظیم الشان ذمہ داری کے انکار و الام پر غور کرتے تھے۔ پھر لوگوں کے معاملات کی دیکھ بھال اور مظالم کے مٹانے میں مصروف ہوتے اور اس سرگرمی سے مشغول ہوئے کہ اس سرگرمی نے خود اپنی ذات سے ان کو بالکل غافل کر دیا اور اسی حالت میں جان اپنے پروردگار کے حوالہ کی۔ ان کی وفات کے بعد کچھ علماء و فقہاء ان کی بیوی کے پاس تعزیت کے لئے آئے اور ان کی وفات سے مسلمانوں پر جو عظیم الشان مصیبت نازل ہوئی تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے ان لوگوں نے ان کے کچھ حالات بیوی سے دریافت کئے کہ آدمی کے حالات سے سب سے زیادہ باخبر اس کی بیوی ہوتی ہے۔ فرمایا۔ کہ نمازیں پڑھنے اور روزے رکھنے میں وہ آپ لوگوں میں سے کسی سے بڑھ کر نہیں تھے لیکن میں نے کوئی شخص ان سے بڑھ کر اللہ سے ڈرنے والا نہیں دیکھا۔ انہوں نے اپنے جسم اور دماغ کو خلق کی خدمت کے لئے بالکل فارغ کر لیا تھا۔ وہ دن بھر خلافت کے فرائض انجام دینے میں منہمک رہتے اور اگر کام شام تک ختم نہ ہو پاتا تو اسکو رات میں لے بیٹھتے۔ ایک دن کا قصہ ہے کہ کام شام تک پورا کر لیا۔ پھر رات میں چراغ منگا جو ان کے ذاتی خرچ پر جلتا تھا۔ دو رکعت نماز پڑھی اور زانو

ٹھوڑی کے نیچے رکھ کے بیٹھ گئے۔ آنسو رخسار پر بہہ رہے تھے۔ اسی حالت میں فجر ہوگئی اور صبح کو روزہ کی نیت کرلی۔ میں نے عرض کی ، امیرالمومنین ، رات کوئی خاص بات ہوئی جس کے سبب سے میں نے آپ کا یہ حال دیکھا۔ فرمایا ہاں تمہیں معلوم ہے کہ میں اس قوم کے تمام سیاہ و سفید کا ذمہ دار بنا دیا گیا ہوں۔ اس ذمہ داری کی وجہ سے مجھے وہ مسافر غریب اور مظلوم قیدی اور اس طرح کے دوسرے لوگ یاد آئے جو اس ملک کے مختلف گوشوں میں کس مپرسی اور پریشانی کے حال میں ہوں گے۔ میں نے خیال کیا کہ اللہ تعالےٰ ان کے بارے میں کل مجھ سے سوال کرنے والا ہے ، اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم ان کے وکیل بن کر مجھ سے حجت کریں گے۔ مجھے ڈر ہوا کہ نہ اللہ کے سامنے میرا کوئی عذر کام دے گا اور نہ پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے میری کوئی حجت چلے گی۔ اس خیال سے مجھے اپنے بارہ میں بڑی پریشانی ہوئی۔"

پھر وہ فرماتی ہیں:۔

"خدا کی قسم عمر (عمر بن عبدالعزیز) اس حال میں ہوتے جس حال میں مرد اپنی بیوی کے ساتھ نہایت خوش ہوتا ہے کہ دفعتہ ان کو اللہ تعالےٰ کی کوئی بات یاد آجاتی اور وہ اس طرح تڑپنے لگتے جس طرح وہ گوریا جو پانی میں گر پڑی ہو۔ پھر ان کی چیخ نکل پڑتی۔ میں ان کا یہ حال دیکھ کر لحاف ہٹا دیتی۔ وہ فرماتے کاش میرے درمیان اور اس خلافت کے درمیان مشرق اور مغرب کی دوری ہوتی۔" (کتاب الخراج صفحہ ۱۰۹)

قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ نے اپنے زمانہ کے مشہور عباسی خلیفہ ہارون الرشید کو اسکی ذمہ داریوں کے بارہ میں جو نصیحتیں کی ہیں اس سلسلہ میں ان کا جان لینا بھی فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ اس سے ایک طرف تو یہ اندازہ ہوگا کہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ محض چند افراد کے انفرادی رجحانات کا مظاہرہ نہیں ہے بلکہ مسئلہ کی دینی اور علمی حیثیت بھی یہی ہے ، اس کے سوا کوئی اور روش اگر کوئی شخص اختیار کرتا ہے تو صرف یہی نہیں کہ وہ اچھے لوگوں کی روش کے خلاف ایک رویہ اختیار کرتا ہے بلکہ اسکی یہ روش اسلام اور اس کے تقاضوں کے بھی خلاف ہے اور دوسری طرف اس سے یہ اندازہ ہوگا کہ ہمارے سلف صالحین اپنے زمانہ کے باجبروت خلفاء کو نصیحت کرنے اور ان کو حق بات پہنچانے میں کتنے بے خوف تھے۔ قاضی ابو یوسف صاحب ہارون الرشید کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں:۔

"اے امیرالمومنین ، اللہ تعالےٰ نے آپ پر ایک بہت بڑی ذمہ داری ڈالی ہے جس کا ثواب بھی بہت بڑا ہے

اور دین کا عذاب بھی بہت بڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے سپرد اس امت کی خلافت کی ہے، اس وجہ سے آپ کو صبح اور شام ان بہت سے لوگوں کی خدمت میں سرگرم رہنا پڑے گا جو آپ کی امانت میں دیئے گئے ہیں اور جن کے ذریعہ سے آپ کو آزمایا گیا ہے اور جن کے معاملات کا انتظام آپ کے سپرد کیا گیا ہے۔ اسکو خوب یاد رکھیے کہ جس عمارت کی بنیاد تقویٰ پر نہ ہوگی، اللہ تعالیٰ اسکو اس کی بنیاد سے ہلا دے گا اور اس کے بنانے والے کے اوپر اسکو گرا دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے جو ذمہ داری آپ پر ڈالی ہے اسکو خدا کے حکم کی خلاف ورزی کر کے ضائع نہ کیجئے۔ قوت اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق عمل کرنے میں ہے۔"

پھر آگے چل کر فرماتے ہیں:-

"تم کل اللہ سے اس حال میں نہ ملو کہ تم اس کے راستہ سے ہٹ کر چلنے والوں میں گنے جاؤ کیونکہ روز جزا میں بدلہ دینے والا آدمیوں کو ان کے اعمال کے مطابق بدلہ دے گا، ان کے دنیاوی مدارج کے لحاظ سے بدلہ نہیں دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو پہلے سے آگاہ کر دیا ہے اس وجہ سے ہوشیار رہیئے اور اس بات کو خوب یاد رکھیے کہ اس نے آپ کو غیر مسئول نہیں بنایا ہے اس وجہ سے وہ آپ کو پرسش کے بغیر نہیں چھوڑیگا۔"

ہماری نئی مطبوعات

اشتراکیت اور نظام اسلام — تالیف: محمد مظہر الدین صاحب صدیقی بی۔اے
بار سوم — قیمت: چار روپے آٹھ آنے

"ہیگل مارکس اور نظام اسلام" کے نام سے اس کتاب کے دو ایڈیشن پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ اس تیسرے ایڈیشن میں مؤلف موصوف نے تین اہم باب کا اضافہ کیا ہے اور اس طرح سے بہت سے وہ مباحث جو پہلے تشنہ رہ گئے تھے مکمل کر دیئے ہیں۔ اب اس کتاب میں اشتراکیت کے نظری اور فلسفیانہ عقائد کے علاوہ اسکی ابتداء، نشوونما اور عروج کے حالات درج کئے گئے ہیں نیز اشتراکیت کے مابعد الطبیعاتی افکار پر ایک نئے باب کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ یہ دعوے تو اب بھی نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اس موضوع پر یہ کتاب ہر حیثیت سے مکمل ہے لیکن جہاں تک مصنف کے امکان میں تھا اس نے اشتراکی تحریک کے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔ اردو زبان کی کسی اور کتاب میں اشتراکیت کے متعلق اتنی معلومات یکجا نہیں ملیں گی۔ ضخامت پہلے سے ڈیڑھ گنا ہو گئی ہے۔

اشتراکیت اور اسلام — تالیف: مولانا مسعود عالم صاحب ندوی
بار سوم — قیمت: دو روپے آٹھ آنے

یہ کتاب آج سے چار سال پہلے شائع ہوئی تھی۔ اور چھ سات ماہ کے عرصہ میں ہاتھوں ہاتھ نکل گئی۔ ملیالم میں اس کا ترجمہ شائع ہو کر مقبول ہوا۔ گجراتی ترجمہ کی بھی ایک صاحب ذوق نے اجازت لی۔ اب دوسرا ایڈیشن بہت سے حذف و اضافہ کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

اس کتاب میں اسلام اور اشتراکیت کی تعلیمات کا تقابلی مطالعہ اور اشتراکیت کے خلافِ فطرت معاشی اصولوں کی علمی و فنی تنقید کی گئی ہے۔ اور اس کے مابعد الطبیعاتی نظریوں پر ایک ناقدانہ نظر بھی ڈالی گئی ہے نیز اسلام کے معاشی نظام کی تشریح بھی ہے۔

ملنے کا پتہ:- **مکتبہ جماعت اسلامی۔ ذیلدار پارک۔ اچھرہ۔ لاہور**

اسلامی حکومت اور مذہبی حکومت میں فرق

(از عبدالحمید صاحب بی اے)

زیردستوں پر زبردستوں کے ظلم و استبداد کی داستان اتنی ہی پرانی ہے جتنی مدنی الطبع انسان کی عمرانی زندگی کی تاریخ۔ ستم کش کے یہ ہتھیار ہر زمانے کے حالات اور عوام کے میلان و اعتقاد کے مطابق بدلتے تو رہے۔ لیکن کاٹ سب کی یکساں رہی۔ مظلوم الحال انسانوں پر اگر ایک وقت میں قیصر و کسریٰ کی شکل میں ملوکیت نے ظلم ڈھائے تو دوسرے وقت میں پوپ پادریوں اور برہمنوں نے مذہبیت کی قبا سے دستِ ظلم دراز کیا۔ اس لئے اگر شہنشاہیت کا نام لینے سے ہمارے سامنے شام و عراق کے سلاطین، مصر و روما کے بادشاہوں، اور چین و ہندوستان کے خاقان و فغفور اور راجاؤں کے جور و جفا کا تصور آتا ہے تو مذہبی حکومت یا تھیوکریسی کا نام لینے سے بھی نمائندگانِ مذہب اور اربابِ کلیسا اور برہمنوں کے لرزہ خیز مظالم کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔ انسانی ذہن فوراً پلٹ کر ان بیگناہ شہداء تحقیق کی طرف جاتا ہے، جنہوں نے انتہائی مظلومیت اور بے کسی کی حالت میں ان مذہبی دیوانوں کے ہاتھوں اذیت و موت پائی۔ مذہبی گروہ کے نام سے انسان کی آنکھوں کے سامنے پرغضب چہرے، چڑھی ہوئی تیوریاں، شرر فشاں آنکھیں، تنگ سینے اور پادریوں کے بھدے دماغ ہی آتے ہیں۔ جنہوں نے تہذیب و شائستگی اور شرافت و متانت کی ہر متاع سے دامن جھاڑ لیا۔ جنہوں نے نہایت ہی کج فہمی سے زمانہ کے رہوار کا رخ ان منزلوں کی طرف پھیرنا چاہا جن کو یہ طے کر چکا تھا۔ اس گروہ کے پیش نظر صرف ایک کام تھا کہ لوگوں کو خدا اور آخرت کا نام لے کر ان کی اموال کے گاڑھے پسینے سے حاصل کی ہوئی کمائی کو ذاتی آرام و آسائش پر بے دریغ صرف کریں۔ تھیاکریسی کی اصطلاح سب سے پہلے قدیم یہودی مؤرخ جوزیفس نے وضع کی۔ اور اس سے مقصود وہ اندازِ حکومت تھا جو بنی اسرائیل کی ابتدائی زندگی میں مروج تھا۔ بنی اسرائیل کے ہاں خدا کے متعلق یہ عقیدہ موجود تھا۔ کہ وہ ان پر حکومت کرتا تھا۔ شروع شروع میں اس عقیدہ سے مفہوم کچھ ہی ہو۔ لیکن رفتہ رفتہ خدا کی حکومت کچھ اور ہی صورت اختیار کر گئی۔ چنانچہ ان کے ہاں یہوہ (خدا) کا مقدس ہیکل اور کتب شریعت (جو در اصل فقہا کے فتاوے پر مشتمل تھی) خود

احبار و رہبان ——— ان تینوں کے مجموعہ کا نام حکومت خداوندی تھا۔ ان کے ہاں اجتہاد کا تو تصور ہی نہ تھا۔ تورات کی تختیاں ایک مقدس صندوق میں بند، ایک مقدس مقام پر رکھی رہتی تھیں۔ اب خدا کی کتاب شریعت جس طرح مدون ہوتی تھی اس کی تفصیل بلنچلی کے الفاظ میں دیکھئے، وہ اپنی کتاب (Theory of the State) میں لکھتا ہے۔

"قانون الٰہی ایک سونا منڈھے ہوئے صندوق میں رکھا جاتا تھا۔ جس کی دو کروبی حفاظت کرتے تھے۔ اور جس کی تعظیم الہام ربانی کے مرکز کی حیثیت سے کی جاتی تھی۔ تابوت خیمہ کے اندر ایک پردہ کے پیچھے قدس الاقدس میں رہتا تھا۔ اور کاہنوں کی طرف سے پورے اہتمام سے اس کی نگرانی ہوتی تھی۔ یہیں کا کاہن اعظم یہوہ کے احکام معلوم کرتا اور لوگوں کو مطلع کرتا۔ قضاۃ جو قبائل میں شریعت کی تنفیذ پر مامور تھے اور یہ کام خدا کے نام پر انجام دیتے تھے کیونکہ حکم صرف اللہ کے لئے تھا اور اگر ان کے سامنے کوئی معاملہ ایسا آجاتا جس کا فیصلہ ان کے لئے مشکل ہوتا تو اس میں ان کے لئے ضروری ہوتا کہ لادیوں کے ذریعہ سے خدا کی مرضی معلوم کریں"۔

یہ تو تھی احبار و رہبان کی حکومت۔ جب ان میں بادشاہت آگئی تو بادشاہ کے متعلق یہ عقیدہ قائم کیا گیا کہ وہ مامور من اللہ ہے۔ اور خدا کی مرضی کو پورا کرنے والا۔ چنانچہ ہیکل کی برکات بادشاہ کے شامل حال اور مقدس راہبوں کی دعائیں اس کی محافظ و نگران ہوتیں۔ اسی طرح حکومت اور برہمنیت کے امتزاج سے ایک ایسا خدائی نظام حکومت وجود میں آگیا۔ جو مقدس استبداد کا مجسمہ تھا۔ وہی نظام جو ہندوستان میں برہمن اور کھشتری راجاؤں کے تعاون سے وجود میں آیا۔ اس نظام میں راجہ کو ایشور کا اوتار قرار دیا جاتا تھا جس کی رکھشا (حفاظت) براہمنوں کی اشیرباد (دعا) کرتی تھی۔ یہی وہ روح تھی جو مسلمانوں کے دورِ حکومت میں بادشاہ کو ظلِ الٰہی قرار دینے کا موجب بنی۔

دورِ جدید میں تھیاکریسی کی مثال تبت میں لاما۔ اور جاپان میں رشنٹوازم کے مطابق) شاہنشاہ جاپان کی حکومت ہے۔ جنہیں زمین پر خدا سمجھا جاتا ہے۔ اور جن کے تقدس کا یہ عالم ہے کہ اگر بادشاہ سڑک پر سے گزر رہا ہو۔ تو کھڑکیاں بند کر دی جاتی ہیں۔ کوئی مکان شہنشاہ کے مکان سے بلند تر نہیں کرایا جا سکتا۔[1] کسی شخص کو بھی بادشاہ پر تنقید کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ وہ جاپانیوں کا معبود ہے۔ اور ہر لحاظ سے بری من الخطا ہے۔ پوپ کا اقتدار بھی اسی شان

[1] دیکھئے Insid Asia: By John Gunther

کی جھلک ہے۔

اسلامی حکومت کو بدقسمتی سے اسی طرح کی مذہبی حکومت سمجھ لیا گیا ہے۔غیر تو غیر خود مسلمانوں کا ایک اچھا خاصا طبقہ اسلامی حکومت سے یہی مراد لیتا ہے اسی لئے اس کی طرف دعوت دینے والوں کی آواز وحشت و دیوانگی کی آواز اور ایک ناقابل عمل نظریئے کی آواز سمجھتا ہے۔

اس افسوسناک غلط فہمی کے اسباب و علل کا جب ہم تجزیہ کرتے ہیں جس کی وجہ سے اسلامی حکومت کی حقیقت کو سمجھنا غیرمسلموں اور خود مسلمانوں کے لئے دشوار ہو گیا ہے تو ہمیں دو بڑی اور بنیادی غلط فہمیوں کا سراغ ملتا ہے پہلی غلط فہمی یہ ہے کہ اسلام کو اُن معنوں میں محض ایک مذہب سمجھ لیا گیا ہے۔ جن میں لفظ مذہب عموماً بولا جاتا ہے۔ دوسری غلطی یہ ہے کہ اسلامی ریاست اور یہودی اور عیسائی ریاستوں کے مقاصد وجود کے اختلاف کو یکسر نظرانداز کر دیا گیا ہے۔

مذہب کے معنی عام اصطلاح کے اعتبار سے بجز اس کے اور کیا ہیں کہ وہ چند عقائد اور چند عبادات اور مراسم کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے مذہب کو واقعی ایک پرائیوٹ معاملہ ہونا چاہیئے انسان اور خدا کے درمیان۔ لیکن اسلام کا معاملہ اس سے برعکس ہے۔اس کا اپنا ایک نظریہ حیات ہے جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا پوری طرح احاطہ کیئے ہوئے ہے۔ اس لحاظ سے مسلمان مستقل اقدار کے حامل ہیں ایک متعین اسلوب حیات اور انداز زیست کے مالک ہیں۔اُن کا مسلمان ہونا اس حقیقت کا متقاضی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے کسی خانے میں بھی سوائے اسلام کے کوئی رنگ بھر نہیں سکتے۔

اُن کی پوری جد وجہد کا کچھ مقصود ہی یہی ہے کہ اسلامی اقدار کی برتری اور تفوق کے لئے کوشاں رہیں۔عیسائیت یا دوسرے مذاہب کی تعلیم صرف پوجا پاٹ تک ہی محدود ہے۔چنانچہ ازمنہ وسطیٰ میں جب عنان حکومت عیسائی پادریوں کے ہاتھ میں آئی تو اُن کے پیش نظر سوائے ظاہری رسومات کے کوئی متعین پروگرام نہیں تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب مقدس کی جگہ عیسائی راہنماؤں نے لے لی۔اب پیروی ہدایت الٰہی کی مقصود نہیں تھی۔ بلکہ ان پادریوں کی تھی۔ چنانچہ پادریوں نے سیاسی اور معاشرتی زندگی میں جو چاہا کیا۔مگر اُن کو مقبول عام کرنے کے لئے دینی تقدس کا جامہ پہنا دیا اور اپنے افکار و اعمال کو وحی الٰہی سمجھتے رہے۔لوگوں کی وابستگی اس تعلیم سے ختم ہوتی چلی گئی۔ اور اُسکی جگہ پادریوں

کی شخصیتوں نے لے لی۔ حق وہ ٹھہرا جو راہب کہے اور باطل وہ قرار پایا جس کو مذہبی رہنما باطل قرار دے دے۔ قرآن حکیم نے ان کی اس زبوں حالی کا نقشہ کس بلیغ انداز سے کھینچا ہے۔ اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ والمسیح ابن مریم۔ اور پھر اس کے ساتھ ان کی اس غلط روش سے انہیں متنبہ بھی کردیا ہے۔ وما امروا الا لیعبدوا الٰھاً واحدا لا الٰہ الا ھو سبحنہ عما یشرکون۔

اسلام نے انسانوں سے یہ حق بالکل سلب کر لیا ہے کہ وہ از خود معیار حق و باطل قائم کریں۔ یہ حق صرف خدائے واحد کو ہے۔ ہر مسلمان زمین پر شاہد علی الناس، خدا کا نائب، اور امر بالمعروف نہی عن المنکر میں براہ راست خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ اس لئے ایک مخصوص مذہبی گروہ کے پیدا ہونے کا یہاں شائبہ تک نہیں ہو سکتا۔ یہاں تو سارا قصّہ اس بات کا ہے کہ کون اسلام کی تعلیمات سے قریب ترین ہے۔ اس دین حنیفی کی اساس یعنی کلمہ لا الٰہ الا اللہ تو زندہ چیلنج ہے ہر اس حکومت و طاقت کے خلاف جو ایک انسان نے دوسرے انسانوں کو غلام بنانے کے لئے قائم کر رکھی ہے۔

...... یہ طاقت خواہ سلاطین و ملوک کی ہو، امراء و حکام کی ہو، خاندانوں اور نسلوں کی ہو، علماء، صوفیہ و احبار و رہبان کی ہو، خواہ جمہوریت و ذہنیت کی ہو، خواہ خود اپنے نفس کی کیوں نہ ہو، یہ ہر اس نظام تمدن و معاشرت اور سیاست کے خلاف بغاوت ہے جو انسانوں نے خدائی قوانین کی منظوری کے خلاف قائم کر رکھے ہیں۔ تمام اطاعتیں اور اختیارات اسی اللہ العلی کے ماتحت ہیں۔

یہ ہے وہ بنیادی اختلاف جو اسلامی ریاست اور مذہبی ریاست میں پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دونوں ریاستوں کے اساسی تخیلات ایک دوسرے سے متغائر ہیں۔ عیسائیت کے معرض وجود میں آجانے کے بعد سیاسیات پر اس کا گہرا اثر ہوا۔ پادریوں نے دنیا کے سامنے جو سیاسی فلسفہ پیش کیا وہ یہ تھا کہ حکومت گناہ کا نتیجہ ہے۔ اور اس لئے یہ برائی ہی برائی ہے۔ خداوند تعالیٰ نے سزا کے طور پر انسانوں کو ریاست کے حوالے کر دیا ہے۔ اس لئے انسان کی اپنی مرضی کا اس میں قطعاً کوئی دخل نہیں۔ ظلم و تعدی کے بازار میں عام ہونے کی وجہ صرف یہی ہے کہ لوگوں کا اعمال نامہ سیاہ ہے۔ لہٰذا لوگوں کو حکومت و اقتدار کے معاملہ میں کسی طرح دخیل نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ نہایت ہی صبر و شکر سے اس استبداد کو برداشت کرتے رہنا چاہئے۔ تاکہ ان کے گناہوں میں کمی واقع ہوتی رہے۔ اگر اس ڈھانچہ کو بدلا گیا تو یہ برسر اقتدار گروہ

کے خلاف بغاوت نہیں بلکہ پروردگار عالم کے خلاف بغاوت ہے۔ چنانچہ اس حقیقت کی طرف پروفیسر Collins نے اپنے مشہور لیکچر بعنوان Unity, Catholic and Faith کی طرف مندرجہ ذیل الفاظ میں اشارہ کیا ہے "کلیسا ایک ایسی سماج میں ہے جس کی بنیاد انسانوں نے نہیں رکھی بلکہ خداوند تعالیٰ نے خود رکھی ہے، لہٰذا جس قسم کی حکومت بھی موجود ہو عین منشا الٰہی کے مطابق ہے۔ اور اس میں رد و بدل کا خیال بھی راہ راست سے انحراف ہے"۔ اسی نظریہ کا نتیجہ پروفیسر Gilchrist کے الفاظ میں یہ نکلا کہ ہر قسم کی مطلق العنانی اور استبدادیت جائز ہو گئی[1]

ریاست کے اس نظریہ کے برعکس اسلام میں خلافت الٰہیہ کے قیام کا مقصد وحید یہی ہے کہ یہ زمین ظلم و عدوان کی بجائے عدل، فتنہ و فساد کی بجائے امن، سرکشی و خونریزی کی بجائے باہمی محبت و وفا کیشی سے معمور ہو جائے۔ اور معصیت و عصیاں کاری، افتراق و تفرقہ آرائی دنیا سے ختم ہو کر عصمت و عفت، نیکی و امن، حق گوئی و راست بازی کا سکہ چل جائے۔

قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے۔

الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ و اٰتوا الزکوٰۃ و امروا بالمعروف و نھوا عن المنکر

یہ وہ لوگ ہیں جن کو اگر ہم زمین میں تمکن عطا کرتے ہیں تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم کریں گے اور بدی سے روکیں گے۔

قرآن مجید کے مطالعہ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اگر دنیا میں نیکی کا دور دورہ نہیں تو پھر اس کے لئے جدوجہد کرنی چاہیئے۔ یہاں تو استبدادیت کے سامنے سپر ڈال لینے کے برعکس اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ظلم و عدوان مالک ارض و سموات کے منشا کے خلاف ہے۔ اس لئے اسے جلد از جلد انسان کو اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی سے ختم کر دینا چاہیئے۔ اسلام تو نام ہے اس یقین انگیز، ایمان پرور اور باطل شکن تحریک کا، جس میں انسان ہر غیر الٰہی ظالمانہ نظام کو ختم کر کے ایک نئے نظام کی بنیاد خدائی ہدایت کے مطابق رکھے۔ ایک انسان کا دوسرے انسان کی اطاعت و تعبد اختیار کرنا اسلام کے نزدیک شرف انسانیت کے خلاف ہے۔ اس لئے وہ تمام انسانوں سے پکار پکار کر کہتا ہے کہ اگر تم سرفرازی چاہتے ہو تو ان تمام طاقتوں سے بیزاری کا اعلان کر دو۔ بلکہ ان کے

[1] Gilchrist

خلاف حق آمادہ ہو جائے۔ جو انسان نے اپنی مرضی سے بنا ڈالی ہے۔ اور صرف خدائے واحد کی اطاعت و وفاداری کو اپنا شعار بنائے۔

مذہبی حکومت اور اسلامی حکومت کے ان بنیادی نظریوں کے اختلاف کی وجہ سے دونوں کے طریق کار میں نمایاں حد محسوس ہونے لگتا ہے۔ غیر اسلامی مذہبی ریاست، با اقتدار لوگوں کو ایک ایسے محفوظ مقام پر لا بٹھاتی ہے جہاں تنقید کے کسی تیر کی رسائی نہ ہو کیونکہ اقتدار وہ براہ راست خدا سے حاصل کرتے ہیں اور وہ اسی کے سامنے جواب دہ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ خداوند کریم کا اُن کے ہاتھوں میں عنانِ اختیار دے دینا اُن کو ہر خطا سے پاک و منزہ کر دیتا ہے۔ آرتھر ٹمپل لٹیلٹن (Arthur Temple Lyttelton) نے اپنے ایک لیکچر میں یہ کہا ہے کہ یسوع مسیح کا سینٹ پیٹر کو یہ کہنا کہ تم میری بھیڑوں کے رکھوالے ہو۔ نہ صرف سینٹ کے مقام کو بلند و برتر کرتا ہے۔ بلکہ اُسے ہر گناہ سے منزہ ہونے کا بھی وعدہ دیتا ہے۔ اس لئے رومن کیتھولکوں کا خیال ہے کہ کوئی نہ کوئی شخصیت دنیا میں ایسی موجود رہنی چاہیئے جو ہر خطا سے پاک ہو۔ اس نظریے نے انسانوں کے ہاتھ میں لامحدود اختیارات دے دیئے۔ اور یہیں سے یورپ میں ظلم و عدوان کا ایک ایسا بحران اٹھا کہ سارا براعظم اس کی لپیٹ میں آگیا۔

اسلامی ریاست کی اساس یہ ہے کہ حاکمیت صرف خدا کی ہے۔ قانون ساز بھی وہی ہے۔ اور جو اختیارات انسانوں کو دیئے گئے ہیں وہ تفویض ہوئے ہیں مالکِ ارض و سماوات سے۔ یہ وہ مقدس امانت ہے جو اُسے سونپی گئی ہے۔ یہاں تک تو مذہبی اور اسلامی ریاست میں کوئی اختلاف نہیں۔ مگر جہاں ان کے راستے الگ ہو جاتے ہیں وہ یہ ہے کہ اسلام خدا کی حاکمیت اور اس کے اقتدار اعلیٰ کے تحت مسلمانوں کو ایک عوامی حاکمیت (Limited Popular Sovereignty) عطا کرتا ہے۔ بار خلافت کی امین پوری ملت اسلامیہ ہے نہ کہ ایک فرد واحد۔ ملت اسلامیہ ہی خلیفہ کو منتخب کر سکتی ہے۔ وہی اُسے معزول بھی کر سکتی ہے ملتِ اسلامیہ ہی مسلمانوں کی مجلس عاملہ (Executive) کو چنے گی، اور اُسے توڑ دینے کا بھی اختیار ہوگا۔ ملت کا ہر فرد نظام خلافت میں ایک مساوی رکن ہے۔ اس کا طبعی نتیجہ ہے کہ خلافت کسی ایک خاندان، نسل یا قبیلہ میں محدود نہیں ہو سکتی۔ خلیفہ عام مسلمانوں پر کوئی خاص ترجیح یا فوقیت نہیں رکھتا۔ وہ مطلق العنان آمر کی حیثیت کا مالک نہیں ہے۔ وہ تو خدا اور جمہور دونوں کے سامنے جواب دہ ہے۔ اسلام میں حکومت کوئی غیر مسئول ادارہ نہیں ہے۔ کہ برسرِ اقتدار

خلیفہ کے جو جی میں آئے کرتا پھرے اور کوئی اس سے پوچھنے کی جرأت نہ کرے۔ رسول اللہ کا ارشاد ہے کہ تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور ہر ایک سے اُس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جا سکتا ہے۔ خود آپ کا عمل اس بات پر گواہ ہے کہ آپ بحیثیت امیر کے جو کچھ کرتے اُس کے بارے میں پہلے اصحاب سے مشورہ لیتے۔

آپ کے بعد خلافتِ راشدہ کے دور میں ایک معمولی سا بدو یا ایک غریب سی بڑھیا بر سرِ عام حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر خلیفہ سے جواب طلب کرتی ہے۔ اور اُن سے پوچھتی ہے کہ اے عمرؓ تم نے یہ کیوں کیا۔ اور یہ کہ تیرا فیصلہ غلط ہے۔ اس قبیل کے واقعات سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ اور پھر ایک بدو کا سب کے سامنے خلیفہ کو یہ کہنا کہ ہم تجھے تنکلے کی طرح سیدھا کر دیں گے اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اسلام میں حاکم اور قوت حاکمہ لوگوں کے سامنے جواب دہ ہے۔ اور وہ مطلق العنان نہیں۔ وہ اپنے اردگرد محافظت کے ایسے حصار تعمیر نہیں کر سکتی جہاں تنقید کا کوئی تیر نہ جا سکے۔ بلکہ وہ تو ہر وقت لوگوں کی نظروں کے سامنے رہتی ہے۔ اور عوام کو یہ حق حاصل ہے کہ اس کے پبلک معاملات پر تو کیا اُس کے پرائیویٹ اور نجی معاملات پر بھی اگر ضرورت ہو تو بلا دریغ حرف گیری کریں اور اگر وہ اپنی اصلاح نہیں کرتی تو اُسے برطرف کر دیا جائے۔

مذہبی حکومت میں چونکہ حاکم کو مافوق الطبعی قوتوں کا حامل سمجھ دیا جاتا ہے۔ اس لئے وہاں مشورہ کی ضرورت پیش ہی نہیں آتی۔ اسلام نے نبوت کے سلسلہ کو نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم کر کے یہ اعلان کر دیا ہے کہ خداوند تعالےٰ کی طرف سے انسانوں کے سامنے جو مکمل ترین نمونہ تا قیامت پیش کیا گیا ہے وہ صرف حضور اقدس کی ذات گرامی ہے۔ اسلئے مسلمان ہونے کی صورت میں وہ سوائے رسولِ خدا کے کسی کی مستقل بالذات پیشوائی و رہنمائی تسلیم نہ کریں۔ دوسرے انسانوں کی پیروی جب بھی کی جائے تو وہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کے تحت ہو۔ آپ کے اس دنیا سے تشریف لیجانے کے بعد کسی کو خداوند تعالےٰ کی طرف سے براہ راست پیغام نہیں آئے گا۔ لہٰذا کوئی شخص بھی بری عن الخطا ہونے کا مدعی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کسی کو بھی تنقید سے بالاتر نہیں رکھنا چاہیے۔ کسی اور کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ جب بھی کوئی معاملہ پیش آ جائے تو اُسے باہم مشورہ سے طے کیا جائے۔ نبی کریمؐ کا زندگی بھر یہ معمول رہا کہ جب کبھی کوئی اہم معاملہ درپیش آتا تو وہ اہلِ مدینہ کو مسجد میں جمع ہونے کا حکم صادر فرماتے۔ اور اُن سے مسئلہ زیرِ بحث پر رائے لی جاتی اور باہم مشورے سے جو فیصلہ ہوتا کیا جاتا۔ آپ کے بعد آپ کے صحابہ کا بھی یہی عمل رہا ہے

اسلامی حکومت اور مذہبی حکومت کا سب سے آخری فرق دونوں کے نظام مالیات میں ہے - Leopold Ranke نے اپنی شہرہ آفاق کتاب The History of the Pope میں بتایا ہے کہ مذہبی ریاست کے مالیات کا بیشتر حصہ اُن عہدوں سے وصول ہوتا تھا جن کو بیچا جاتا تھا۔ پھر جو لوگ ان عہدوں کو خریدتے اُن پر فیس وغیرہ کی وصولی کی قطعاً کوئی پابندی عاید نہیں کی جاتی تھی۔ وہ جس قدر چاہتے لوگوں سے جائز و ناجائز طور پر لوٹتے۔ عوام ان ظالم ٹھیکیداروں کے رحم و کرم پر تھے۔ قرآن حکیم نے بھی اُن کی اس حالت کو بیان فرمایا ہے۔

یا ایھا الذین آمنوا ان کثیرا من الاحبار والرھبان لیاکلون اموال الناس بالباطل ویصدون عن سبیل اللہ

اگر آپ اس نظام مالیات پر ایک نگاہ ڈالیں تو بادی النظر میں یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ اس نظام میں ٹیکسوں اور فیسوں کا سارا بوجھ سماج کے سب سے نچلے طبقہ پر آ گرتا ہے۔ امراء و برسر اقتدار طبقہ اس قسم کے بوجھ سے بالکل محفوظ رہتا ہے۔ ایک طرف تو یہ ہر قسم کی عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں اور اُن کی مقناطیسی حیثیت ارد گرد سے مزید دولت سمیٹتی رہتی ہے۔ دوسری طرف عوام ہر لحظہ مفلوک الحال ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس جب ہم اسلامی نظام مالیات پر غور کرتے ہیں تو حالات اس سے بالکل مختلف پاتے ہیں۔ زکوٰۃ جو ریاست کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے امراء سے وصول کر کے صرف غرباء کی جیبوں تک پہنچایا جاتا ہے۔ اس کا مقصد ہی یہی ہے کہ سماج کے اندر دولت کی گردش عام ہو۔ اور جمع شدہ دولت مسکینوں اور غریبوں کو سہارا دینے کے لئے استعمال میں لائی جائے۔ اس نظام کا منشا ہی یہی ہے کہ سماج میں غیر فطری معاشی تفریق کو مٹا کر معاشی عدل کا دور دورہ ہو۔ اور کوئی شخص سماج میں مفلوک الحال نہ رہے۔

یہ چند بنیادی اختلافات ہیں جو ایک اسلامی ریاست اور مذہبی ریاست میں پائے جاتے ہیں ؛

رسائل و مسائل

یہ ذلّت و مسکنت کیوں؟

سوال: میں نے ترجمان القرآن ماہ شوال کا مطالعہ کیا ہے۔ میں اپنے جذبات کا اظہار کرنے سے قاصر ہوں۔ کہ اس کے ہر مضمون نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ اس سے پہلے میں گمراہی کی جانب بھٹک رہا تھا۔ اور اپنی قوم کی ساری بیماریوں کا علاج ایک اجنبی شفاخانے میں ڈھونڈ رہا تھا۔ لیکن تھا یہ مجبوری کی وجہ سے!

میں تسلیم کرتا ہوں۔ کہ ہمارا اسلام ایک ایسا مکمل نظام ہے۔ جو ہر زمانے میں اور زندگی کے تمام شعبوں میں انسانی زندگی کے توازن کو قائم رکھ سکتا ہے۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ آج نہ صرف پاکستان اور ہندوستان میں، بلکہ ساری دنیا میں اس دین برحق کے پیرو نیم جان ہو کر دم توڑ رہے ہیں۔ اس حالت میں اگر ہم لوگ اس اصول کی اشاعت و تبلیغ کی کوشش کریں۔ تو فطرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر یہ نظام برحق ہے۔ (اور یقیناً برحق ہے) تو اس کے نام لیواؤں کی حالت کیوں بد سے بدتر ہوتی چلی جا رہی ہے؟

میں قنوطیت کا قائل نہیں ہوں۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ باوجود ایک ہولناک انقلاب سے گذرنے کے میں یقین کرتا ہوں کہ موجودہ تاریک دور ختم ہو کے رہے گا۔ اس تاریکی میں امید کی ایک ہلکی سی کرن "جماعت اسلامی" سے نمایاں ہو رہی ہے۔ ایک مدت سے میں خود جو رہا تھا کہ کیا ہمارے ملک میں کوئی ایسی جماعت افراد ہے جو صراط مستقیم کی طرف ہم سب کو لے چلے اور صالح قیادت کو بر روئے کار لانے کا فریضہ ادا کر سکے۔ میری نگاہ میں بجز اس جماعت کے اور کوئی نہیں جو پیش نظر مقصد کے لئے مناسب ہو۔ کیا میں امید کروں۔ کہ آپ لوگ اس خاکسار کو اپنے ساتھ لے کر خدمت دین کا شرف بخشیں گے؟

جواب: آپ کے تاثرات کو معلوم کر کے مسرت ہوئی۔ ایک صالح الفطرت آدمی کی بڑی علامت یہی

ہوتی ہے۔ کہ وہ چاہے ساری عمر بھٹکتا پھرا ہو لیکن جونہی کوئی نشانِ ہدایت اس کے سامنے آتا ہے۔ وہ اس کی طرف بے تابانہ لپکتا ہے۔ جیسے پیاسا پانی دیکھ کے اس کی طرف اضطراراً بڑھتا ہے۔ ایسے لوگ ہدایت الٰہی سے بالعموم محروم نہیں رکھے جاتے۔ خدا آپ کو دینِ حق کے شعور سے بہرہ ور کرے جس کے بغیر زندگی، زندگی نہیں ہے۔

اسلام کے نام لیواؤں پر دنیا میں جو کچھ گذر رہی ہے۔ کون بدبخت مسلمان ایسا ہوگا جس کا دل اس صورت حال پر نہ کڑھتا ہو لیکن یقین جانیے کہ نظامِ قدرت جس عدل و انصاف پر چل رہا ہے۔ یہ سب کچھ عین اسی عدل و انصاف کے تحت ہو رہا ہے۔ اور کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو اللہ کے قانونِ عدل کے نفاذ میں حائل ہو سکے!

خدا کے انبیاء نے جہاں کہیں بھی دعوت دی ہے۔ ان کی پوری جدوجہد ایک ایسی جماعت کو منظم کرنے کے لئے تھی جو گردوپیش کے لئے مشعل بردارِ ہدایت بن کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے، یا دوسرے الفاظ میں شہادت علی الناس کی خدمت کا بیڑہ اٹھائے۔ انبیاء نے ہمیشہ کُونُوٓا اَنصَارَ اللّٰہِ کی صلائے عام دیکر ایک 'حِزبُ اللّٰہ' مرتب کرنے کی کوشش کی ہے اور اس حزب اللہ یا خدا کے لشکر کا مقصد وجود یہ تھا کہ یہ افراد، جماعتوں، قوموں، ملتوں اور سلطنتوں کو خدا ناشناسی اور فسق و فجور سے ہٹا کر خداپرستی اور راستی و عدل کی بنیادوں پر استوار کرے۔ اور اس عالمگیر مہم میں اپنی جانوں اور مالوں کی پوری پوری بازی لگا دے۔ یہ اللہ کی سپاہ خود اللہ کی مطیع فرمان ہو۔ اور دوسروں کو اس کا مطیع فرمان بنائے۔ اور اللہ کی سلطنت میں جو طاقت بھی باغیانہ اور سرکشانہ رویہ اختیار کرے، اس کا زور توڑ دے، یہاں تک کہ "یَکُونَ الدِّینُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ"! ـــــ زندگی میں طاعت اور وفاداری ساری کی ساری صرف اللہ ہی کے لئے رہ جائے۔

اس فوج میں شرکت کرتے ہوئے ہر فرد حاکمِ کائنات سے ایک معاہدہ کرتا تھا جس کے معنی آج بھلائے جا چکے ہیں لیکن جس کے الفاظ مسلمان قوم کے ذہن سے کھرچ کر بھی الگ نہیں کئے جا سکتے۔ یہ کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت جو آج ہم آپ ادا کرتے ہیں۔ اور اذانوں اور نمازوں میں بار بار دہراتے ہیں، یہ ایک عہد ہے جس کی ذمہ داریاں نگاہوں سے اوجھل ہو چکی ہیں۔ اس معاہدے کی وسعتِ مفہوم کو قرآن میں یوں واضح

کیا گیا ہے :-

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ	اللہ نے جنت کے بدلے میں مومنین سے ان کی جانوں اور مالوں کا سودا کر لیا ہے۔ (کہ وہ اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں صرف کرینگے)

پھر اس معاہدے کو پورا کرنے کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نصرت و تائید کا یقین دلایا کہ :-

ان تنصروا اللہ ینصرکم	اگر تم خدا (کے دین) کی مدد کرو گے۔ تو اللہ تمہاری مدد کرے گا۔

پھر خیر و شر یا کفر و اسلام کی کشمکش میں حق کی کامیابی کی ضمانت دی کہ :-

کَتَبَ اللہ لاغلبن انا ورسلی، ان اللہ قوی عزیز	اللہ نے یہ (قطعی فیصلہ) قلمبند کر دیا ہے کہ لازماً میں اور میرے رسول ہی (حق و باطل کی جنگ میں) غالب رہیں گے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ قوت و غلبہ رکھنے والا ہے۔

یہاں تک کہ زمین میں تمکن و غلبے کا اور منصب خلافت پر فائز کرنے کا وعدہ بھی کھول کر فرمایا کہ :

وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلکم	اللہ نے تم میں سے (صحیح معنوں میں) ایمان لانے والوں اور عمل صالح پر کاربند رہنے والوں کو یہ وعدہ دیا ہے۔ کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلافت دے گا جیسے اس نے تم سے پہلوں کو دی تھی۔

اِس امداد و نصرت اور تائید کا وعدہ بنی اسرائیل کو جب دیا گیا تھا تو ان سے تفصیلاً یہ شرائط طے ہو گئی تھیں کہ :-

وقال اللہ انی معکم لئن اقمتم الصلوۃ واتیتم الزکوۃ واٰمنتم	اور (وعدہ دیتے ہوئے) اللہ نے ان سے کہا کہ میں تمہاری پشت پناہی کروں گا بشرطیکہ تم نے نماز کو قائم

برسلی وعزرتموهم و اقرضتم الله قرضا حسنا لاکفرن عنکم سیاتکم ولادخلنکم جنت تجری من تحتها الانهار۔ ـ ـ ـ ـ ـ ومن کفر بعد ذلک منکم فقد ضل سواء السبیل۔ فبما نقضهم میثاقهم لعنهم وجعلنا قلوبهم قسیه۔ یحرفون الکلم عن مواضعه ونسوا حظا مما ذکروا به ولاتزال تطلع علی خاینة منهم، الا قلیلا منهم، فاعف عنهم واصفح، ان الله یحب المحسنین ط

کیا، زکوٰۃ دی، میرے رسولوں پر ایمان لائے اور ان کے مشن کو کامیاب کرنے کی جدوجہد میں حصہ لیکر، ان کی مدد کی، اور (اللہ کے دین برحق کو غالب کرنے کے لئے) اللہ کو (جان و مال کی صورت میں) قرض حسنہ دیا ـــ (پھر یقین رکھو) کہ میں ضرور ہی تم سے گناہوں کو ہٹا دونگا۔ اور تم کو ضرور ہی اس جنت میں جگہ دونگا جس میں نہریں بہتی ہیں ـــ اور اس معاہدے کے بعد تم میں سے جس نے روگردانی کی۔ وہ (سمجھ لے) کہ بھٹک کر ٹیڑھے راستے پر پڑ گیا۔ پھر (بنی اسرائیل) کے اس معاہدے سے پھر جانیکی وجہ سے ہم نے ان پر لعنت برسائی (جس کی وجہ سے) ہم نے ان کے قلوب کو ایسا سنگین کر دیا کہ وہ (ہماری کتابوں کے آیات و احکام کو ان کے موقع و محل سے ہٹاتے ہیں، اور جس دین کی ان کو تعلیم دی گئی تھی اس کے ایک حصے کو بھلا چکے ہیں ـــ اور یہی وجہ ہے کہ کوئی لمحہ ایسا نہیں جاتا کہ تم کو انکی کسی نہ کسی خیانت کی اطلاع نہ ملتی ہو۔ ہاں ان میں سے تھوڑے ہیں جنہیں مستثنےٰ کیا جا سکتا ہے۔ سو (اے نبی صلعم!) آپ ان سے درگزر کریں۔ اور نرمی برتیں۔ بلاشبہ اللہ احسان کرنیوالوں کو پسند کرتا ہے۔

یہ آیت ایک آئینہ ہے جس میں بنی اسرائیل ہی نہیں، ہم بھی اپنے چہرے کے حسن و قبح کو دیکھ سکتے ہیں۔ اس

میں یہ بات صاف کر دی گئی ہے کہ جو لوگ معاہدے کی عملی شرائط پر کاربند رہیں، صرف وہ اس کے مستحق ہیں کہ اللہ کی معیت و نصرت ان کو حاصل ہو۔ رہے وہ جو معاہدہ باندھ کے اس کی شرائط کو توڑیں تو وہ رحمت الٰہی سے دوری ہی کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ آپ سوچیئے کہ جو نقشہ اس آیت میں کھینچا گیا ہے کیا وہی جُوں کا تُوں آج نگاہوں کے سامنے نہیں ہے؟

یہ ایک سادہ سی حقیقت ہے کہ ہر حکومت اپنی فوج کی نگہبان ہوتی ہے اور ایک ایک سپاہی کی خاص قدر و منزلت اس کی نگاہ میں ہوتی ہے لیکن اسی صورت میں کہ فوج وفادار سپاہیوں پر مشتمل ہو لیکن اگر فوج بے عمل ہو۔ اور حکومت سے باغی ہو جائے تو پھر اس کا حشر باغیوں ہی کا سا ہوتا ہے اور حکومت کی امداد اور اس کی نگہداشت ختم ہو جاتی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ کس طرح آپ کی سرکاری پولیس کا ایک ادنیٰ سپاہی یکہ و تنہا بستیوں اور جنگلوں میں گھومتا ہے۔ اور کس بیباکی سے مجرمین پر ہاتھ ڈالتا ہے؟ یہ محض اس وجہ سے کہ وہ جب تک حکومت کا دیانتدار خادم ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ریاست کی ساری مشینری اس کی پُشت پر ہے۔ لیکن کوئی سپاہی اگر پولیس لائن سے مفرور ہو جائے، اگر افسروں سے باغی ہو جائے، اگر چوروں اور ڈاکوؤں سے جا ملے۔ تو پھر ایک دم وہ دیکھے گا کہ حکومت کی ساری مشینری اس کے خلاف ہو گئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ عام پبلک بھی اس کی عزت کرنے کی بجائے اس کی سرکوبی پر تیار ہے۔

اب لیجئے اپنی حالت کو ۔ ہم لوگ دنیا میں اعداد و شمار کے لحاظ سے کم از کم ستاون کروڑ سپاہیوں کی ایک فوج ہیں۔ اور فوج بھی زبانی دعوے کے لحاظ سے حاکم کائنات کی! لیکن اس فوج کا حال کیا ہے؟ یہ اپنا مقصد وجود بھول چکی ہے، یہ ڈسپلن کو ختم کر چکی ہے، یہ بھرتی کے بنیادی معاہدے تک کا مفہوم ذہن سے نکال چکی ہے، یہ اپنی مقررہ ڈیوٹیوں سے بے نیاز ہو چکی ہے۔ لیکن اتنا ہی نہیں، حال یہ ہے کہ اس کے بیشمار سپاہی وہ ہیں۔ جو اُس حاکم کے وجود تک پر شبہ کرتے ہیں جس کی فوج میں بھرتی ہوئے تھے، پھر وہ ہیں جو اس مقصد کو ہی برحق تسلیم نہیں کرتے جس کے لئے فوج قائم ہوئی تھی۔ پھر وہ ہیں جو ان ضوابط اور ان شرائط کا اور ان پر عمل کرنے والوں کا مذاق اڑاتے ہیں جو معاہدہ میں اپنے حاکم سے طے کر چکے ہیں۔ پھر وہ ہیں جو خدائی فوج میں نام درج کرنے کے بعد عین اس کے دشمنوں اور باغیوں کے پاس اپنی خدمات فروخت

کرتے پھرتے ہیں۔ اور پھر سب کے سب منتشر اور بے نظم ہو کر زمین کا بوجھ بنے ہوئے ہیں۔

کیا آپ سمجھتے ہیں۔ کہ حکمرانِ کائنات ایسی فوج کا بھتہ ذیل کر دیگا؟ کیا ایسی فوج دنیا کے قلعے سر کرے گی؟ کیا ایسی فوج کو بہادری کے انعامات اور تمغے بٹنے چاہئیں؟ کیا ایسی فوج کو اس کے کارناموں پر خطابات اور اعزازات عطا ہوں گے؟ کیا ایسی فوج کو حکومت آفاق کے جملہ ذرائع و وسائل کا تعاون حاصل ہونا چاہیے؟

—— اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو یقین جانیئے کہ آپ نے اس نظام عدل کو نہیں سمجھا جس کے مطابق خدا تعالیٰ قوموں اور اُمتوں سے معاملہ کرتا ہے۔

اللہ کو دو ٹکے والے ممبروں کی کثرتِ تعداد کی ضرورت نہیں۔ اس کو تو صرف اطاعت و وفاداری مطلوب ہے۔ اس کے دین کا قیام محض "نام لیواؤں" کے ذریعے نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ایمان و عمل صالح رکھنے والوں کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس آسمان کے نیچے دنیا میں دو دو لاکھ کی تعداد رکھنے والی جماعتیں طوفان بپا کئے ہوئے ہیں۔ عین اسی آسمان کے نیچے ستاون کروڑ کی فوج ہر گوشۂ زمین پر مار کھا رہی ہے۔ آبروئیں لٹ رہی ہے۔ تذلیل و تحقیر کا نشانہ بن رہی ہے۔ گھروں سے بے گھر ہو رہی ہے۔ قانون اور لاقانونی سے کچلی جا رہی ہے۔ روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کے لئے ایمان و ضمیر بیچتی پھرتی ہے۔ شکستوں پر شکستیں کھا رہی ہے۔ بلکہ یوں کہیئے کہ جینے کے اوسان سے جتن کر رہی ہے۔ لیکن ایک نہیں کر رہی۔ تو صرف خدا سے وفاداری کو بحال کرنے کا اہتمام نہیں کر رہی!

ہم بالفرض ستاون کروڑ نہ ہوتے۔ دو کروڑ ہوتے۔ ستاون لاکھ ہوتے۔ ستاون ہزار ہی ہوتے۔ لیکن اپنے معاہدے پر قائم۔ اس کی شرائط کے پابند۔ اپنے مقصدِ وجود کے فدائی۔ اپنے نصب العین کے لئے سرگرم۔ اپنے فرائض کی ادائی کے لئے اعتصام بحبل اللہ سے منظم ہوتے۔ تو ہم دنیا میں تہلکہ مچا رکھنے کے لئے کافی ہوتے۔ پھر ہماری عزت، ہماری حفاظت، ہماری فتح، اور ہماری کامیابی کا ضامن خود حکمرانِ کائنات ہوتا۔ اور اس کی کائنات کی پوری محسوس اور غیر محسوس قوتیں ہمارے ساتھ ہوتیں۔

خدا کا اور خدا کے دین کا نام لیوا بن کر اس کی حکومت کو تسلیم کر کے اور اس کی نوکری کا جُوا سر دن پر رکھ لینے کے بعد پھر اس سے مذاق کرنا اور اس کے احکام کو ٹھکرانا اور اس کے دیئے ہوئے نظامِ زندگی

سے انحراف کرنا وہ خوفناک جرم ہے جو "ضالین" کی سطح سے بھی گرا کر "مغضوب علیہم" کے گڑھے میں جا گراتا ہے۔ اس قسم کی کھلی بغاوتوں کا انجام ہمیشہ "ضربت علیہم الذلۃ والمسکنۃ" کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ اور خدا ہم سب کو اس سے بچنے کی توفیق دے۔

بایوس ہونا صرف ان لوگوں کا کام ہے جن کے سامنے اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اس کے قوانین اور وعدوں کی صداقت کا یقین نہ ہو۔ ہم لوگ تو صرف یہ سمجھ کے کام کرنے لگے ہیں کہ ہم پر ہمارے خالق و مالک کی طرف سے کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور انہیں پورا کئے بغیر اس کی سلطنت میں رہنے اور اس کے خزائن رزق سے فائدہ اٹھانے کا حق ہمیں نہیں پہنچتا۔ اور یہ سمجھ کر کہ اس کی اطاعت کرنے کی صورت میں اس کی نصرت و تائید بہر حال ہمارے ساتھ ہے۔

جماعت اسلامی ایک طرف ملت اسلامیہ کے منتشر سپاہیوں کو ان کے بنیادی معاہدے کا شعور اور ان کے اصل مقصد کا احساس دلا کر دوبارہ ایک نظم میں سمیٹنے کی جدوجہد کر رہی ہے۔ تاکہ پہلے اپنے ملک میں اور پھر باقی دنیا میں وہ اقامت دین کی مہم سر کر سکے۔ اور دوسری طرف اس کی عام دعوت ہر انسان کے لئے یہ ہے کہ "اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ"۔ پس اس کے دروازے نوع انسانی کے ہر فرد کے لئے کھلے ہیں۔

آپ اگر اقامت دین کے کام میں ہم سے پورا پورا تعاون کرنا چاہتے ہوں۔ تو براہ کرم وقت نکال کر جماعت کے لٹریچر کو ایک مرتبہ پوری طرح پڑھ لیجئے۔ تاکہ دعوت و مقصد کا ہر پہلو آپ کے سامنے آجائے اور آپ اندازہ کرلیں کہ کن نازک ذمہ داریوں کا بار آپ کو اٹھانا ہوگا ◆

مطبوعات

چراغِ راہ
قیادت نمبر

مرتبہ جناب نعیم صدیقی صاحب
قیمت عہ ۔ سالانہ چندہ ۸ روپے
مقامِ اشاعت: دو نیا بلڈنگ ۔ رام باغ روڈ کراچی۔

ماہنامہ چراغ راہ کا پہلا پرچہ چھ ماہ کی طویل نظر بندی کے بعد قیادت نمبر کی شکل میں شائع ہوا ہے۔ اپنے ظاہری اور معنوی محاسن کی بنا پر ملک کے علمی، ادبی رسائل میں اس کا شمار صفِ اول میں ہوتا ہے۔ ان محاسن کے باوجود کہیں کہیں طنز، تعریض اور تنقید کا اشہب قلم حکمت اور موعظۂ حسنہ کی شاہراہ سے ہٹ گیا ہے۔ اور تعمیر کی بہ نسبت تنقید کا پہلو زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ بہرحال مجموعی طور پر موجودہ قیادت کی نقاب کشائی کے مقصد میں یہ نمبر کامیاب ہے۔ اور آئندہ لکھنے والوں کے لئے تنقید و صحیح کی خارزار وادی میں ایک روشن چراغ راہ بن سکتا ہے۔

ہفت روزہ الاعتصام

مرتبہ مولانا محمد حنیف صاحب ندوی،
چندہ سالانہ چھ روپیہ، فی پرچہ ۲ر
مقامِ اشاعت: دفتر انجمن اہلِ حدیث۔ گوجرانوالہ

یہ اخبار انجمن اہلحدیث گوجرانوالہ کی زیرِ سرپرستی شائع ہو رہا ہے۔ مضامین میں تنوع، اندازِ بیان میں متانت اور دقت کے جدید فتنوں پر معقول تنقید، اس کو اپنے دوسرے ہم عصر دینی رسائل و اخبارات سے ممتاز کر رہی ہے۔

مقامِ مسرت ہے کہ اس کا طرزِ نگارش، مناظرانہ رنگ اور محدود قسم کی مذہبیت سے بالاتر ہے۔ توقع ہے کہ اقامت دین کی راہ میں یہ بہترین رفیق اور معاون ثابت ہوگا۔

"ہمارے علماء" کے عنوان سے مبالغہ آمیز اور ثقیل، پُر تکلف، ادبی انداز میں تعارفی مضامین کا سلسلہ الاعتصام کے وقار کے منافی معلوم ہوتا ہے۔ الاعتصام کے دامن کو اس قسم کی مدح سرائی سے پاک ہی رہنا چاہیئے۔

(ع۔ غ۔ ح)

مطبوعات مکتبہ جماعت اسلامی

الجہاد فی الاسلام	۸/۰	اسلام اور ضبط ولادت	۱/-
رسالہ دینیات	۱/۸	سود	۲/۸
حقوق الزوجین	۱/۸	اشتراکیت اور نظام اسلام	۴/۸
مسئلہ قومیت	۱/۸		
مسئلہ جبر و قدر	۱/-	نیا نظام تعلیم	-/۶/-
تجدید و احیائے دین	۱/-	ہندوستان میں تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل	(زیر طبع)
اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر	۱/-		
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	۱/۴	دین حق	-/۹/-
سیاسی کشمکش حصہ اول	۱/۴	اسلام اور جاہلیت	-/۷/-
سیاسی کشمکش حصہ دوم	۲/۸	ایک اہم استفتا	-/۳/-
سیاسی کشمکش حصہ سوم	۲/۸	دستور جماعت اسلامی	-/۳/-
اسلام کا نظام حیات	-/۱۰/۰	روداد جماعت اسلامی حصہ اول	۱/-
پردہ	۲/۸	روداد جماعت اسلامی حصہ دوم	-/۱۳/-
تنقیحات	۲/۸	روداد جماعت اسلامی حصہ سوم	۲/-
خطبات (نیا ایڈیشن)	۳/-	روداد جماعت اسلامی حصہ پنجم	۲/-
تفہیمات	۳/۸	روداد اجتماع خواتین	-/۱۲/-
حقیقت توحید	۱/۲	جماعت اسلامی کی دعوت، بناؤ بگاڑ	فی -/۹/-
حقیقت تقویٰ	-/۱۲/۰	حقیقت شرک	۲/-

عربی مطبوعات

اسلام کا نظریہ سیاسی	۱/-	انسان کا معاشی مسئلہ	۱/-
اسلامی حکومت	۱/-	اسلام اور جاہلیت	۱/-
دین حق	۱/-	شہادت حق	۱/-

ملنے کا پتہ

مکتبہ جماعت اسلامی

۵ الف ذیلدار پارک اچھرہ ۔ لاہور (پاکستان)

نئی کتابیں

اشتراکیت اور نظام اسلام

تالیف

محمد مظہر الدین صدیقی صاحب

"ہیگل، مارکس اور نظام اسلام" کا تیسرا ایڈیشن

بہت سے اضافوں کے ساتھ

ضخامت ۴۰۰ صفحات

قیمت چار روپے آٹھ آنہ

اشتراکیت اور اسلام

تالیف

مولانا مسعود عالم صاحب ندوی

اشتراکیت پر علمی تنقید۔ اسلام کے نظام معاشی کی تشریح

دوسرا ایڈیشن

قیمت دو روپے آٹھ آنے

ملنے کا پتہ

مکتبہ جماعت اسلامی

ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور

سرورق مطبوعہ رپن پریس لاہور

شائع شدہ ماہ جنوری ۱۹۵۰ء

ترجمان القرآن

فہرست مضامین

جلد ۳۲ | ماہ ذی الحجہ ۱۳۶۸ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۴۹ء | عدد ۶

سید ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔